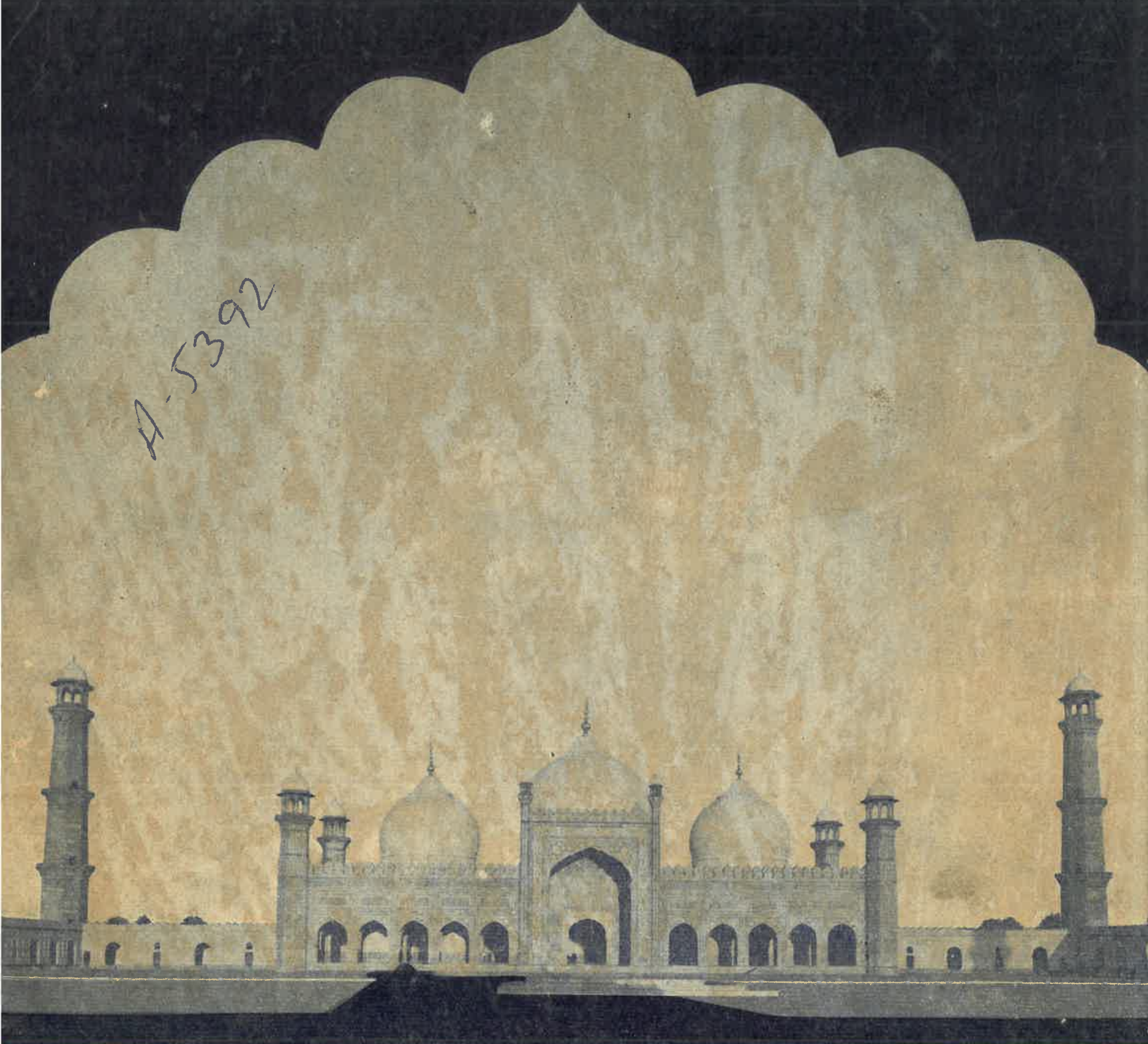

A-5392

بادشاہی مسجد لاہور

تاریخ ○ فنِ تعمیر ○ متعلق علماء

از

احقر العباد ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا

بادشاہی مسجد لاہور

(تعمیر ۱۰۸۴ھ)

تاریخ ○ فنِ تعمیر ○ خطبا

از: احقر العباد ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

A-5392

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

۱۹۷۲ء

مسجد کے صدر مشرقی دروازہ کے ماتھے پر کتبہ

A-592

جملہ حقوق محفوظ ،

کتاب ——— "بادشاہی مسجد لاہور"

طبع اوّل ——— اکتوبر ۱۹۷۲ء ،

مطبع ——— دین محمدی پریس لاہور ۔ نثار آرٹ پریس لاہور

تعداد ——— ۱۷۲۰

ناشر ——— کتاب خانہ نورس ۔ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

مصنفہ ——— ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ،

قیمت ——— [redacted] روپے

مصنف کی انگریزی میں تالیف 'بادشاہی مسجد' کے بعض امور پر مزید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں ۔

فہرستِ مطالب کتاب "بادشاہی مسجد لاہور"

مع چار صفحات تصاویر

مقدمہ	۴
حصۂ اوّل : مسجد کی جائے وقوع	۵
فدائی خاں کوکہ مہتمم تعمیر مسجد	۵
تعمیر مسجد کا فرمان	۶
متن فرمان	۶
مسجد کا معمار	۶
مسجد کا افتتاح	۷
حصۂ دوم : تفصیل تعمیر مسجد	۷
عمارت کا مصالح	۷
مسجد کا صدر دروازہ	۸
مسجد کا فرش ، انتظام پانی	۹
دالان	۹
مسجد کے کماندار طاق	۱۰
ایوان کا ماتھا	۱۰
ایوانِ مسجد	۱۰
محراب و منبر	۱۱
گنبد	۱۱
مینار	۱۲
مسجد کی ضروری پیمائشیں	۱۲
مسجد کی زیب و زینت	۱۲
مسجد بحیثیت عیدگاہ	۱۴
مساجدِ عالم میں اس کا مقام	۱۵
حصۂ سوم : پنجاب میں سکھوں کا عہد	۱۷
سکھوں کا خاتمہ اور برٹش کا قبضہ	۱۷
حصۂ چہارم : مسجد، حکومت برٹش کے قبضے میں	۱۸
مسجد کو ۱۸۵۶ء میں برٹش نے مسلمانوں کے حوالے کردیا	۱۹
حصۂ پنجم : مسجد کی ابتدائی مرمت	۲۰
مرمت ۱۸۷۵ء ـــــ ۱۹۲۰ء	۲۱
بڑی مرمت ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۰ء	۲۳
حصۂ ششم : انجمن اسلامیہ لاہور ۱۸۶۶ء	۲۵
برٹش کا زمانہ	۲۵
مسجد بحیثیت آثار قدیمہ	۲۶
سیاسی ماحول بعہد برٹش	۲۷
حصۂ ہفتم : لاہور میں اسلامی ماحول	۲۸
علمائے دین	۲۸
علماء کا مساجد سے تعلق	۲۹
عُلماء کی حق گوئی	۳۰
حصۂ ہشتم : خُطباءِ مسجد	۳۱
مولوی احمد الدین بگوی	۳۲
مولوی غلام محمدؒ بگوی	۳۳
راجہ جہاں داد خاں	۳۳
مسجد کے مؤذن	۳۴
مولوی محمد شفیق بگوی	۳۴
مدرسہ علوم اسلامیہ	۳۵
خطباءِ مسجد : ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۷ء	۳۷
لاہور میں درس قرآن	۳۹
مولوی غلام مُرشد	۴۰
علامہ اقبال	۴۱
مولوی محمد مصلح (بانیٔ تحریک قرآن)	۴۲
نتیجہ	۴۲

مقدمہ

اسلامی سلطنت کا آغاز لاہور - اول سلطنت محمود غزنوی کی فتح سے ۴۱۲ھ سے ہوا۔ اس نے اپنی اس فتح کی یاد میں فوراً یہاں ایک مسجد تعمیر کی جسے مورخین نے اس کی تعمیری خصوصیت کی وجہ سے "خشتی مسجد" لکھا ہے۔ یعنی وہ عام اینٹوں کی تعمیر ہوئی تھی، مگر آج لاہور میں اس مسجد کا جائے وقوع متعین کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے بعد ہی یہاں تعمیر مساجد کا سلسلہ شروع ہوا۔ لاہور میں آج ایک قدیم مسجد شاہ عالمی اور لوہاری دروازہ کے درمیان چوک متی کے قریب موجود ہے جسے نیویں مسجد کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ عام طور پر سطح زمین سے کافی نیچے قریب تیس فٹ ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مسجد دراصل کسی قدیم تاریخی مقام پر تعمیر کی گئی تھی اور اس کی پانی کے نکاس کی قدیم غرقیاں آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور قدیم مسجد یکی دروازہ کے اندر ہے مگر وہ زمین کی سطح کے نیچے نہیں ہے۔ بہرحال ان قدیم مساجد سے ان کی قدامت کی تصدیق ضرور ہوتی ہے۔ لاہور میں شاہ اسمٰعیل بخاریؒ (۴۵۰ھ) کی درگاہ ہال روڈ پر، اور حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (۴۸۵ھ) کی درگاہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ بلکہ ہجویری درگاہ سے تو آئندہ کے لیے لاہور شہر کا قبلہ رُخ ہمیشہ کے لیے طے پا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی زنجانیوں کی درگاہیں بھی قابلِ ذکر ہیں، خاص کر جبکہ حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتیؒ دہلی جاتے ہوئے یہاں لاہور میں حضرت حُسین زنجانی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اسی زمانہ میں یہاں قدیم عیدگاہ بھی تھی جس میں بدر سجستانی مُرید حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے نماز عید ادا کی تھی۔

مگر تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ اکبر بادشاہ نے شہر لاہور کو از سرِ نو تعمیر کیا اور قلعۂ خام کو پُختہ قلعہ کر دیا۔ ساتھ ہی شہر کی چار دیواری مع مختلف دروازوں کے قائم کر دی جبکہ قلعہ اور دریا شہر کے شمال مشرق میں تھے۔ اس عہد کی مسجد آج بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد موجود ہے، جس میں آج بھی اکبر کے عہد کا کتبہ موجود ہے۔ جہانگیر ۱۰۱۴ھ میں تخت نشین ہُوا تو اس کے عہد کے قاضی القضاۃ صدر الصدور نے یہاں ایک مسجد ۱۰۱۵ھ میں تعمیر کی، جس کا کتبہ آج بھی لوہاری منڈی میں مسجد خراسیاں میں موجود ہے۔ اگرچہ جہانگیر نے خود ایک مسجد ۱۰۲۳ھ میں اپنی والدہ مریم زمانی کے نام پر مستی دروازہ کے اندر اور قلعہ کے مشرقی دروازے کے باہر تعمیر کی جسے آج ہم "مسجد بیگم شاہی" کے نام سے پکارتے ہیں مگر شہر کے وسط میں ۱۰۴۴ھ میں نواب وزیر خان نے ایک مسجد بہت بڑی تعمیر کی جو آج بھی اسی کے نام پر "مسجد وزیر خان" مشہور ہے۔ سیاحانِ عالم اس مسجد کی تعمیری خوبیاں دیکھنے آتے ہیں۔ یہ ایک قدیم درسگاہ اسحاق گازرونیؒ (۷۸۶ھ) پر تعمیر ہوئی تھی جن کا روضہ آج بھی اس مسجد کے صحن میں نیچے موجود ہے۔ شاہجہان کے عہد میں ایک اور مسجد ۱۰۴۶ھ میں خواجہ سنعد نے تعمیر کی جس کا کتبہ کناری بازار کی مسجد میں محفوظ ہے۔ خواجہ مقبول نے ۱۰۶۰ھ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی جسے غلطی سے لوگ دائی انگاہ کی مسجد پکارتے ہیں۔ یہ خواجہ سرائے داراشکوہ سے تعلق رکھتا تھا۔

موچی دروازہ میں داخل ہونے پر آج بھی مسجد محمد صالح کنبو (۱۰۶۹ھ) موجود ہے۔ کوچہ چابک سواراں میں مسجد سرفراز خاں ہے جو ۱۰۸۷ھ میں تعمیر ہوئی جسے عام طور پر بوجہ کاشی کاری کے مسجد چینیاں والی کہتے ہیں۔

لاہور ہمیشہ ثقافت اسلامی کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ نہ معلوم یہاں کس قدر مساجد ابتدا سے لے کر آج تک تعمیر ہوئی ہیں، جن کا نہ ہی علم ہے اور نہ ان کا شمار ہی ممکن ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہاں متذکرہ بالا مساجد کی موجودگی میں ایک بہت بڑی مسجد کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا جو لاہور کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی ہو اور ضرورت پر عیدگاہ کا کام بھی دے۔ چنانچہ اس ضرورت کو اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے پورا کیا جو ۲۴ رمضان المبارک ۱۰۶۹ھ کو تخت نشین ہوا وہ پہلی مرتبہ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۳ھ (۸ دسمبر ۱۶۶۲ء) کو لاہور آیا۔ اور باغ دلکشا میں فروکش ہوا اور ۳ شوال ۱۰۷۳ھ کو یہاں سے کشمیر روانہ ہوگیا آخر ۱۰۸۴ھ میں یہاں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

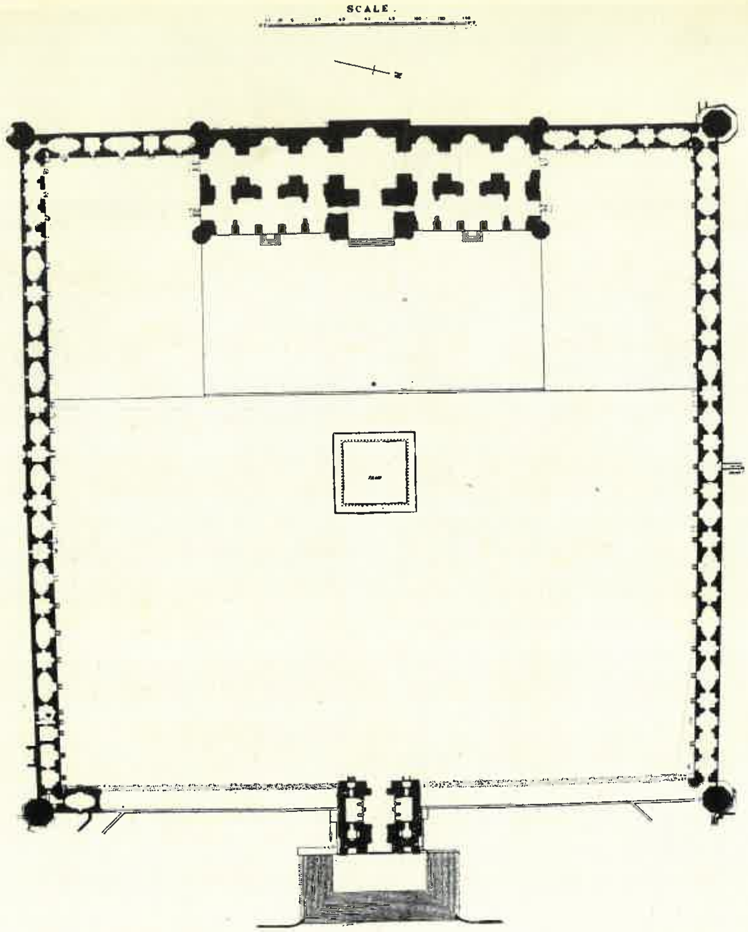

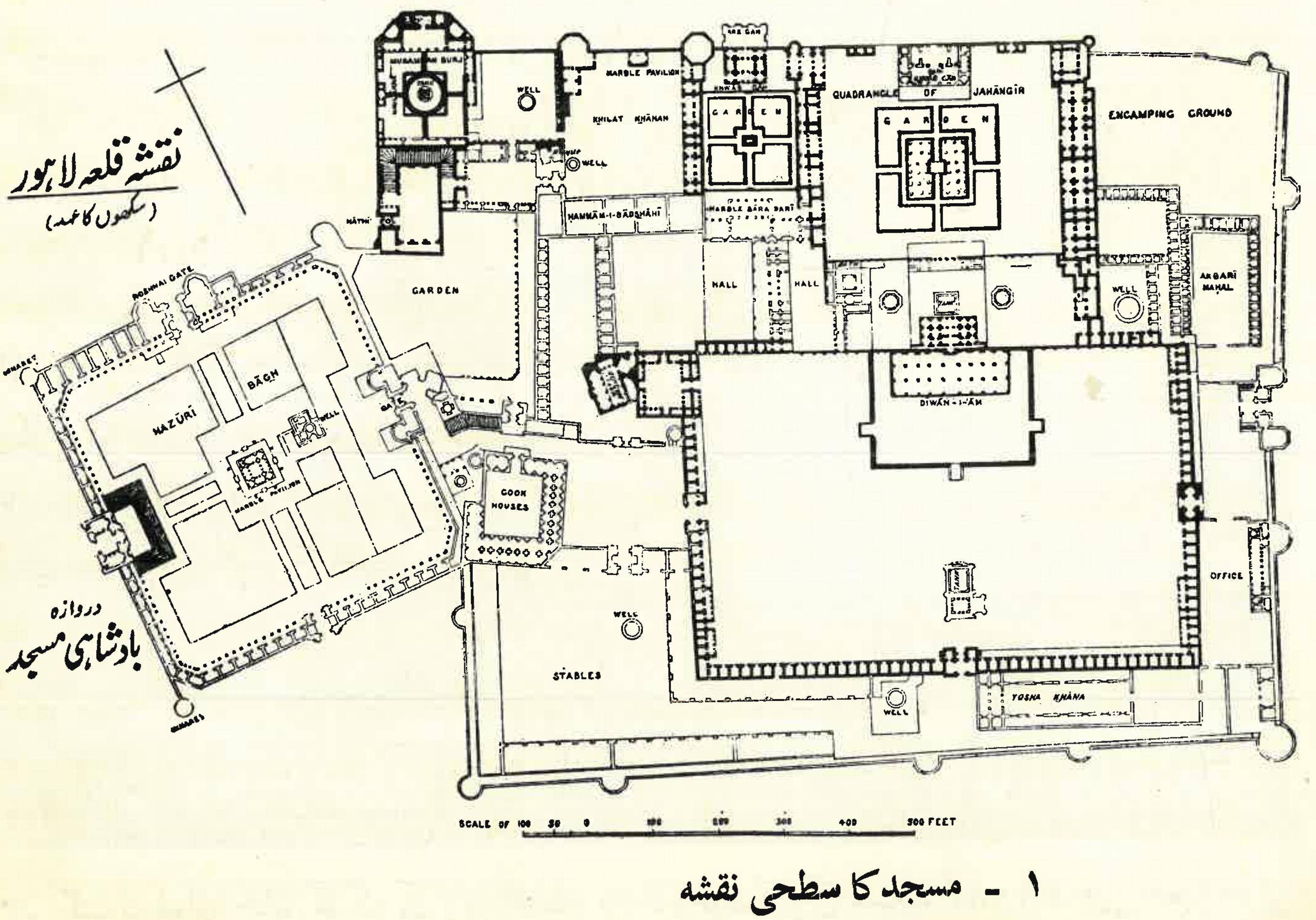

۱ - مسجد کا سطحی نقشہ

۲ - سطحی نقشہ :- مسجد کے سامنے قلعہ و حضوری باغ

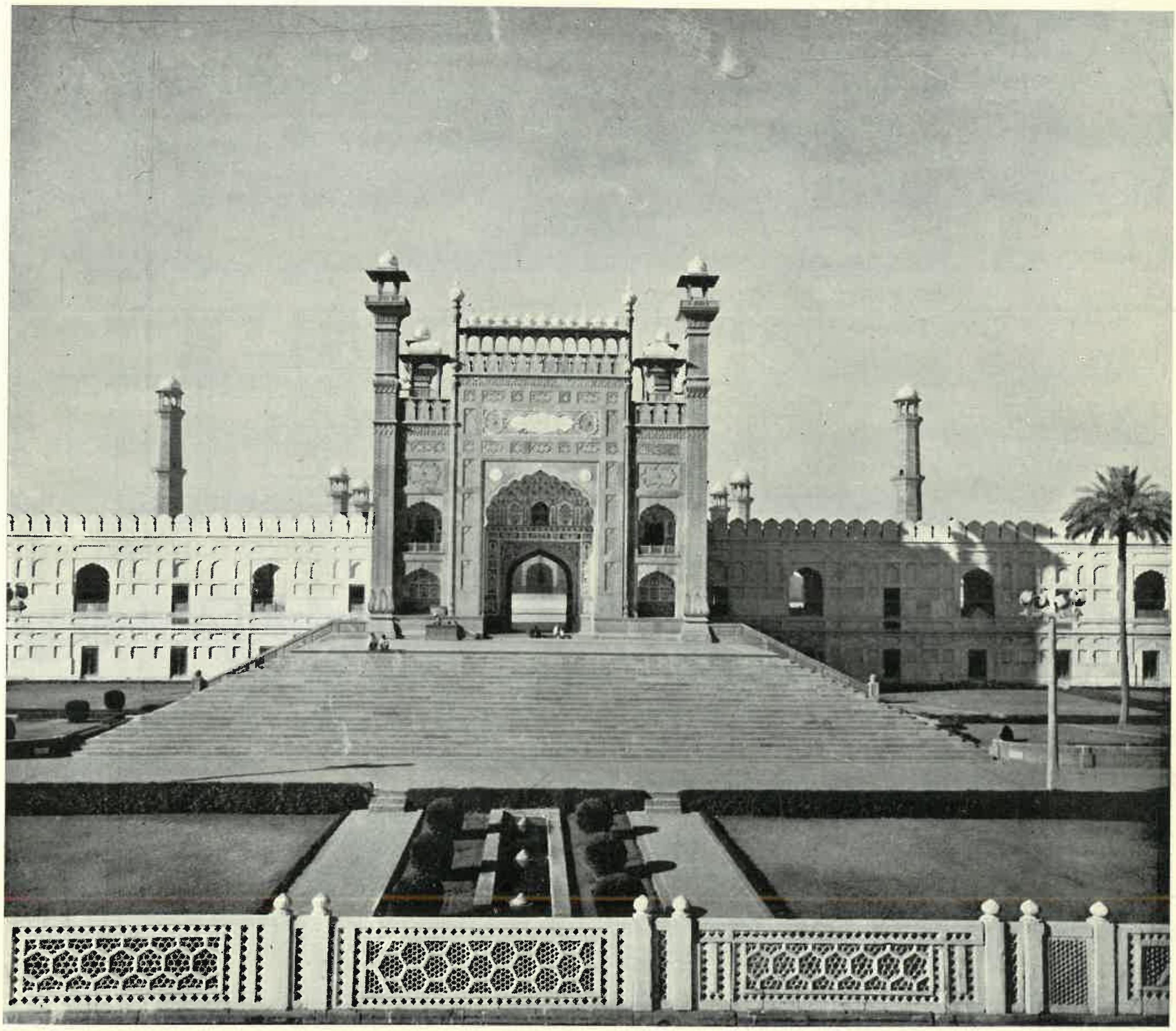

۳۔ کتبہ :۔ فدائی خاں کوکہ کے زیر اہتمام بادشاہ عالمگیر کی مسجد ۱۰۸۴ھ میں تعمیر ہوئی
۴۔ مسجد کا صدر دروازہ

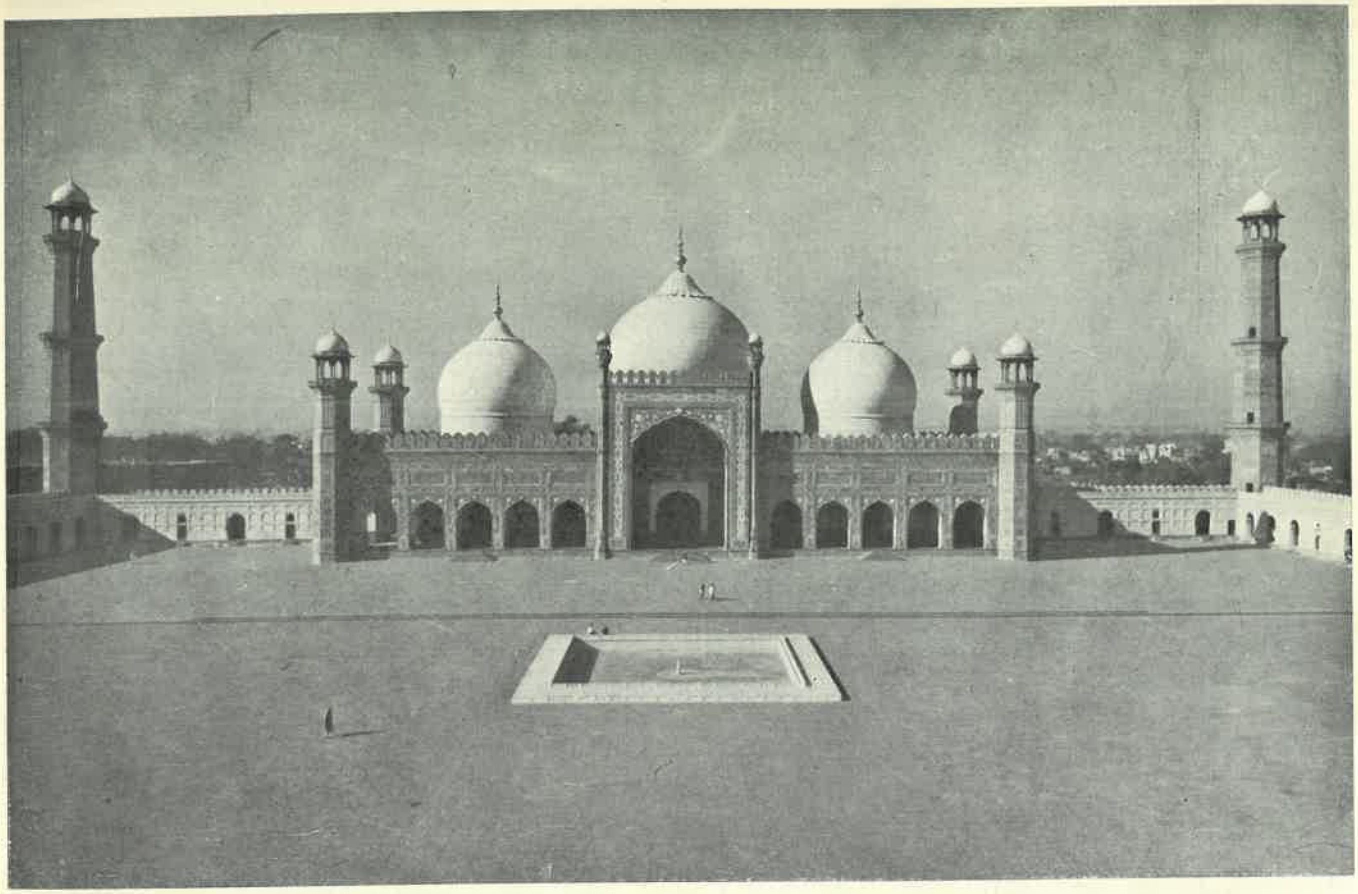

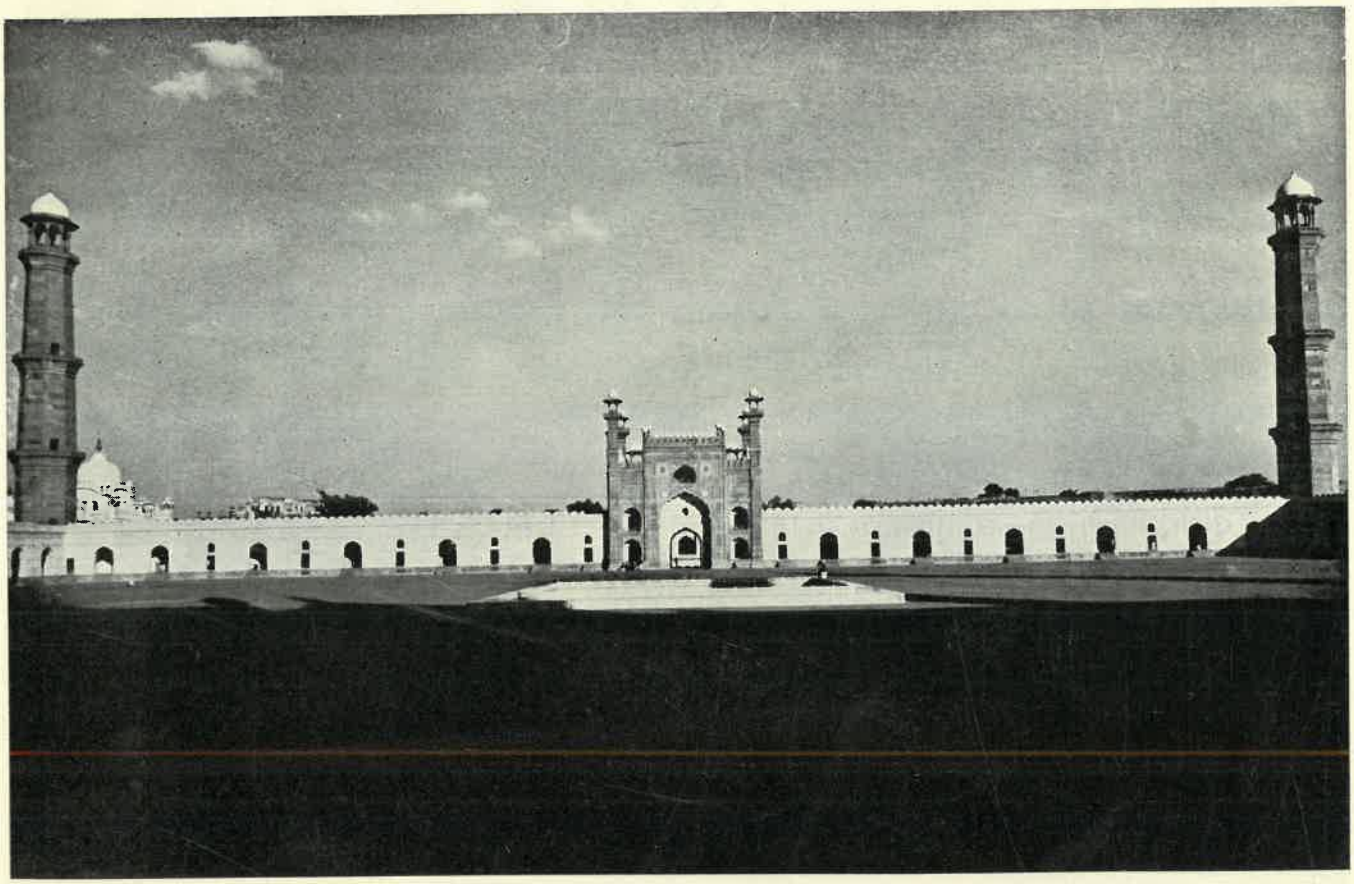

۵- صحن سے : مسجد کا پورا نظارہ

٦- صحن سے : مسجد کے مشرقی حصہ کا عقب

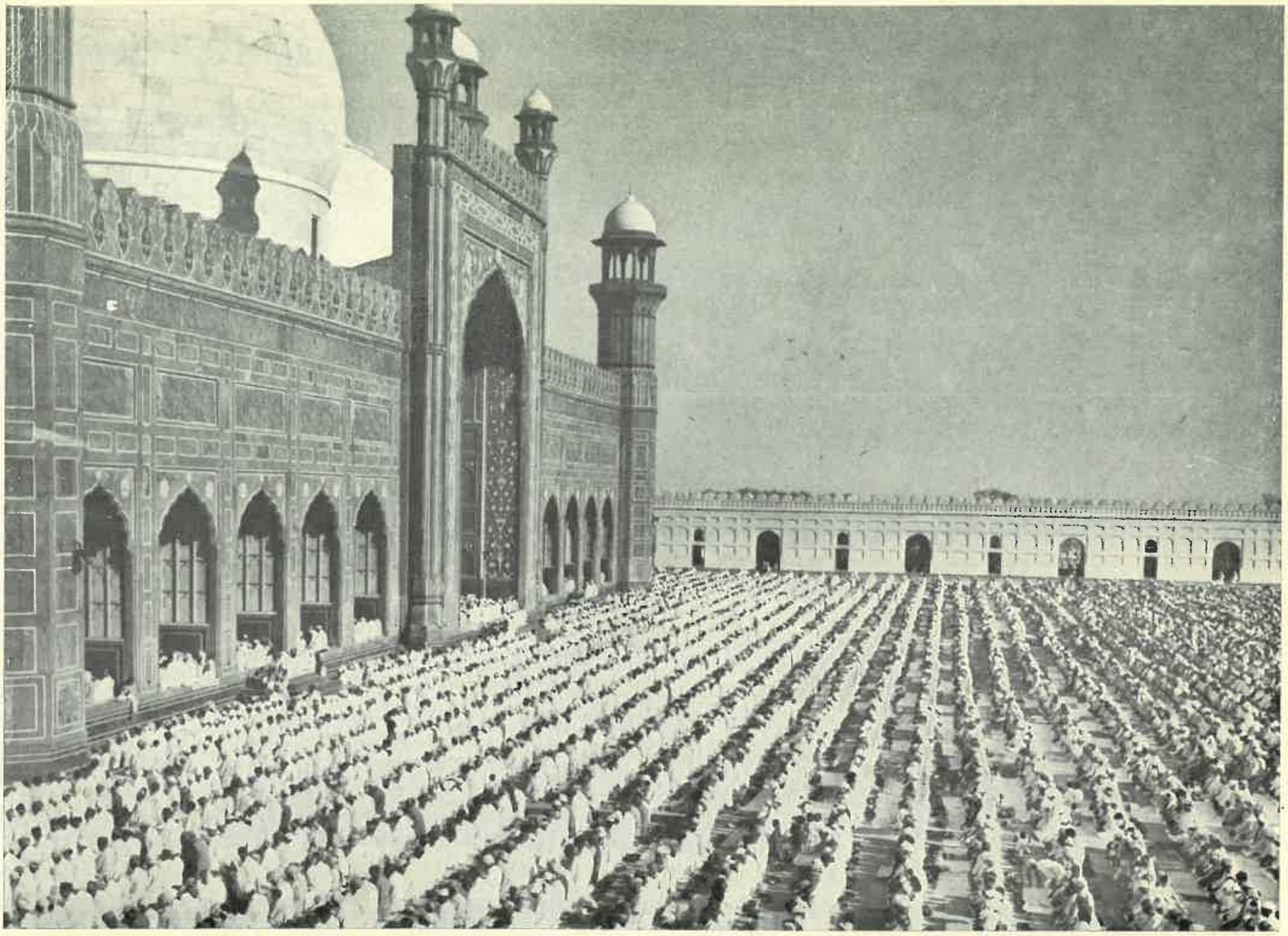

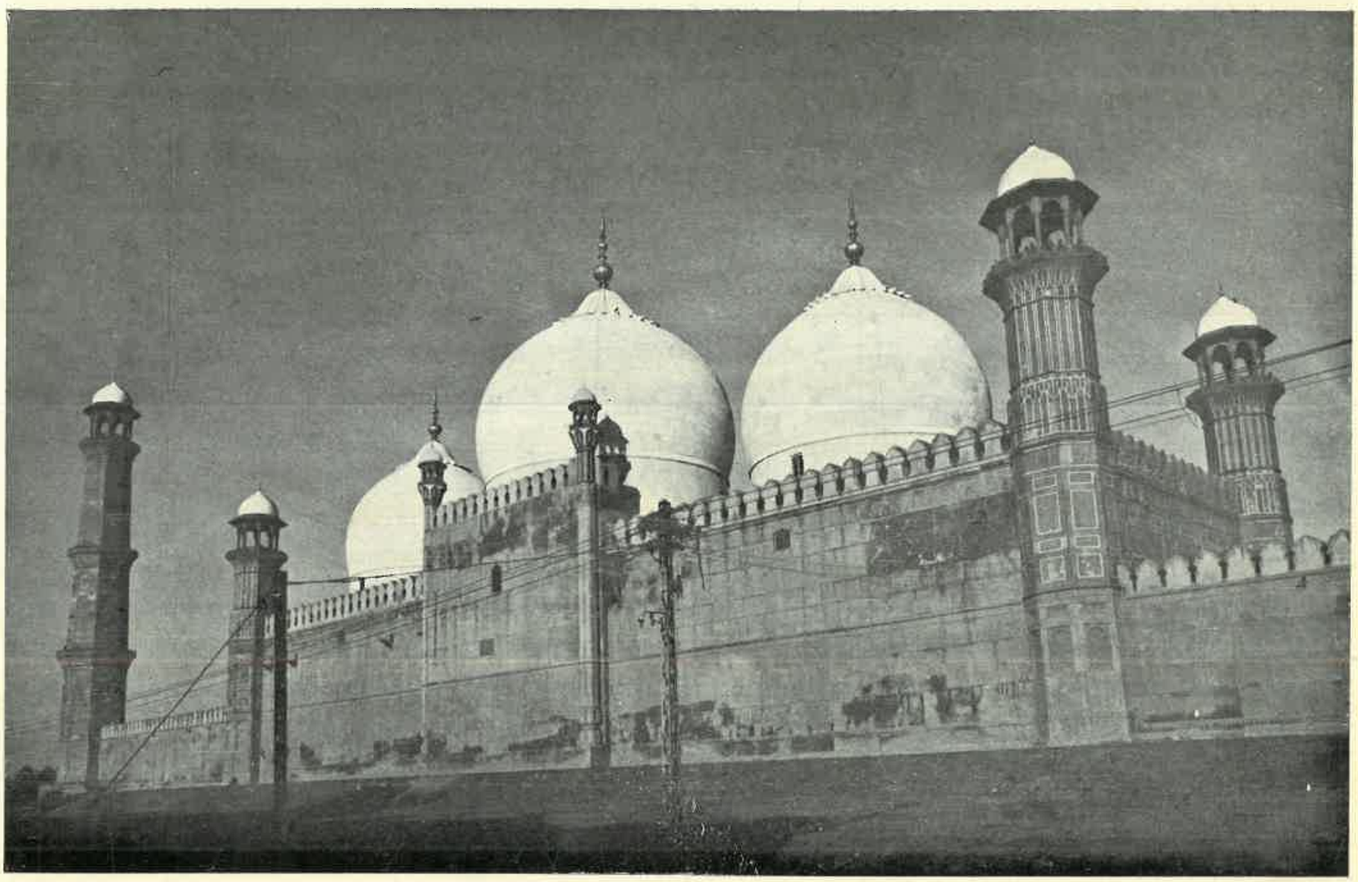

۷ - مسجد میں نماز عید   ۸ - مسجد کا عقب

حصّہ اوّل ۴

مسجد کی جائے وقوع

تاریخ

لاہور کے گرد و نواح کے مطابق اس مجوزہ اور ضروری مسجد عالمگیر کی جائے وقوع بھی ایک خاص مسئلہ تھا، جہاں اہلِ لاہور بآسانی شامل ہوسکیں، چنانچہ اس کے لیے موجودہ مقام کئی وجوہات کو مدِ نظر رکھ کر انتخاب کیا گیا جو نہایت موزوں تھا، یعنی قلعۂ لاہور کے مغربی دروازہ کے قریب مسجد کے مشرق کی طرف اور روشنائی دروازہ کے ہمراہ شمال کی جانب دریائے راوی بطور حفاظتِ شہر موجود تھے۔ بدقسمتی سے آج روشنائی دروازہ ہم پر ۱۹۳۵ء سے بند ہے جو سکھوں کے گوردوارہ اور سمادھ رنجیت سنگھ کی وجہ سے ہُوا، ورنہ بادشاہ اور دیگر اُمراء اسی دروازہ سے داخل ہوتے اور کشتی کے ذریعہ آتے۔ دریائے راوی جو قلعہ کے ساتھ ساتھ بہتا تھا، آج نہیں ہے۔ ویسے آج مسجد تک رسائی کے لیے عام طور پر حضوری باغ کا جنوبی دروازہ جو ایک طرح روشنائی دروازہ کی نقل ہے اور شہر کے لوگوں کے لیے صحیح راستہ ہے۔ بہرحال یہ تمام ماحول نہایت موزوں اور خوبصورت ہے اس ماحول کو مُغل تاریخ میں 'جلوخانہ' لکھا ہے۔

ہم نے مقدمہ میں مختصر طور پر ان تاریخی مساجد کا ذکر کر دیا ہے جو اس مسجد سے قبل تعمیر ہُوئی ہیں، مگر یہ مسجد اورنگ زیب اپنی تمام خوبیوں کی وجہ سے آج دُنیا بھر میں سب سے بڑی مسجد شمار ہوتی ہے جو آج زیرِ استعمال ہیں۔ یہ مسجد ۱۰۸۴ھ میں یہاں تعمیر ہُوئی۔ ہم یہاں سے مسجد کے مشرقی صدر دروازہ میں اکیس سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوتے ہیں اور اس کے بالمقابل قلعہ کا مغربی دروازہ قدیم ہے۔ ویسے یہ مسجد اس ماحول میں آگرہ اور دہلی کی شاہی عمارات کی روایات پر دریائے راوی کے کنارے اور شاہی قلعہ کے قریب تعمیر ہوئی۔ تاریخ سے کسی اور عمارت کا پتہ نہیں چلتا کہ اس مقامِ مسجد پر کبھی کوئی اور عمارت بھی تھی یا کوئی تعمیر کی گئی تھی۔ البتہ جنوب کی طرف باہر عمارات ضرور تھیں جن کا وجود آج نہیں ہے اور نہ ان کی کوئی تفصیل ہی میسر ہے۔

فدائی خاں کوکہ مہتمم تعمیر مسجد

مسجد کے مشرقی صدر دروازہ کے ماتھے پر سفید سنگِ مرمر کی خوبصورت سل پر مندرجہ ذیل کتبہ سیاہ پتھر میں حروف کاٹ کر کندہ کیے ہیں[۵]:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

مسجد ابو المظفر محی الدین مُحمّد عالمگیر بادشاہ غازی سنہ ہزار وہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

باہتمام کمترین خانہ زادان فدائی خان کوکہ"

اس سے واضح ہے کہ یہ مسجد زیر اہتمام فدائی خان کوکہ ۱۰۸۴ھ میں تعمیر ہُوئی۔ یہ شخص اس وقت لاہور میں گورنر کے عُہدہ پر فائز تھا، اور اورنگ زیب کا رضاعی بھائی تھا، جس وجہ سے اسے کوکہ لکھا ہے۔ اس کا وجود مغل تاریخ میں جہانگیر کے زمانہ سے ملتا ہے۔ اس کا اصل نام مظفر حُسین تھا۔ اورنگ زیب نے اس کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے اس کی کافی عزت کی تھی۔ لاہور میں اس نے ایک حویلی بھی بنائی تھی۔ خاص کر لاہور کا حصہ مابین دہلی دروازہ اور اکبری دروازہ اس کے نام پر مشہور تھا اور حویلی بھی وہیں تھی۔ جب اورنگ زیب کو یوسف زئی پٹھانوں

---

۵ صٓ۲ پر کتبہ کا عکس ملاحظہ ہو،

سے لڑنا پڑا تو فدائی خاں کو ۱۰۸۶ھ میں کابل کی مہم پر متعین کیا گیا، جہاں اس نے کارہائے نمایاں دکھائے۔ جب وہ کامیاب ہو کر حسن ابدال میں اورنگ زیب کے حضور میں آیا تو اسے "اعظم خاں کوکہ" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

تعمیرِ مسجد کے لیے شاہی فرمان

یہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ اس مسجد کا کہیں کسی تاریخ سے کوئی حوالہ تک نہیں ملتا مگر محض حُسنِ اتفاق سے میرے ذاتی کتابخانہ میں ایک پرانا مخطوطہ تاریخی تحریروں پر مشتمل موجود ہے۔ ان میں سے ایک تحریر بصورتِ فرمانِ شاہی بھی محفوظ ہے، جس سے واضح ہے کہ صُوبۂ دارالسلطنت لاہور توجہاتِ شاہنشاہی کا مورد بنا اور فرمان شاہی دربار سے جاری ہوا کہ ایک مسجد نزاہت اور لطافت میں ضرب المثل دارالسلطنت لاہور میں تعمیر کی جائے اور صوبہ کے لیے تیس لاکھ روپیہ مسجد کی تعمیر کی خاطر وقف کر دیے گئے۔ اور یہاں کے حکّام کو حکم دیا گیا کہ اس کے مطابق فوراً عمل کر کے مسجد مذکور جلد تعمیر کریں[۵]۔

فرمان کا متن

"اہالی صوبہ دار السلطنۃ لاہور بتوجہاتِ شہنشاہی مشتہد و مباہی بودہ بدانند کہ درینولا بموجب توسیع ذاتی و تکملہ مکارم فطرتی حکم محکم قضا شیم شرف نفاذ یافتہ کہ مسجدی کہ در نزاہت و لطافت ضرب المثل نظارگیان دشوار پسند باشد و از مطرحِ کار و مطمحِ انظار عدیم المثل و مفقود البدل تواں گفت، بدار السلطنۃ مذکور احداث و اساس پذیرد۔ بنا بر فرمانِ سعادت عنوان و توقیع لازم الاذعان بعز ایراد خرچ مبلغ سی لک روپیہ بنظر اشرف الاقدس گزشتہ و مبلغ مذکور بر آں صوبہ تنخواہ یافتہ شائستہ آنکہ مبلغ مسطور را مطابق درکار وقت برای احداث مسجد مذبور لطمالبطہ الاہم فی الاہم بمتصدیان آں کہ از پیشگاہ خلافۃ تعین شدہ اند رسانند و ہرچہ کہ مصالح خرچ و آنچہ کہ لوازمہ و بکار باشد بر حسب استدعای متصدیان مسطور بلاوقف و تاخیر و تعلل و اسہال سربراہ نمایند تا زُودتر مسجد مرقومہ گونہ اتمام و کسوت اختتام پوشیدہ قابلِ مشاہدہ و لائق سجدہ مقدّس گردد۔"

مسجد کا معمار

یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس عظیم الشّان مسجد کی عمارت کے کسی معمار کا ذکر اوراقِ تاریخ عہد سے کہیں نہیں ملتا۔ سوا اس کے کہ ہم نے اوپر مسجد کا اپنا تاریخی کتبہ درج کر دیا ہے اور وہی اطلاع سب پر حاوی ہے۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قدر بڑی عمارت ضرور کسی اعلیٰ مستند معمار کے تحت تعمیر ہوئی ہوگی اور ہزارہا کاریگروں نے اس میں حصہ لیا ہوگا جنہوں نے یہ شاندار کارنامہ اسلامی فنِ تعمیر کا مہیا کر دیا۔ میرے نزدیک وُہ صحیح جذباتِ فن کے لوگ تھے اور وہ اوسکر وائلڈ کا قول ہے۔

"فن کار حسین و جمیل اشیاء کا خالق ہوتا ہے۔ فن کا اظہار اور فنکار کا اخفا فن کا مقصد ہے۔"

۵؎ اس کے علاوہ مصنّف کی تصنیف "فنونِ لطیفہ بعہد اورنگ زیب" ملاحظہ ہو جس سے واضح ہوگا کہ اورنگ زیب نے اور بھی ایسے فنّی کارنامے کئے ہیں۔

بہرحال اورنگ زیب کے عہد سے متعلق عرض ہے کہ اس مسجد کی تعمیر سے قبل اورنگ زیب کی زوجہ دلرس بانو بیگم رابعہ دُورانی کا انتقال اورنگ آباد (دکن) میں ہُوا جس کا روضہ وہاں ایک طرح تاج محل آگرہ کے نقشہ پر ۱۰۷۲ھ میں تعمیر ہُوا جس کا معمار "عطاء اللہ" تھا، جسے ہم نادرالعصر اُستاد احمد معمار لاہوری عہد شاہجہانی کا لڑکا تصوّر کرتے ہیں، کیونکہ اس کا ایک لڑکا عطاء اللہ رشدی ماہر ریاضی تھا جس نے اکثر عمارات عہدِ شاہجہانی میں بنائی تھیں اور احمد معمار لاہوری کے تین لڑکے تھے: عطاء اللہ رُشدی، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ۔ افسوس عہدِ اورنگ زیب کی تاریخوں میں کسی معمار کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک معمار کلیان بن ہیرا کا ذکر مآثرِ عالمگیری میں ملتا ہے۔ غرضیکہ مسجد بادشاہی لاہور کے ضمن میں کسی معمار کا نام نہیں ملتا۔

مسجد کا افتتاح

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمیں کسی تاریخِ عہد میں اس مسجد کا ذکر نہیں ملتا اور یہی صورت اس کی تعمیر کے بعد اس کے افتتاح کی ہے مگر بادشاہ نے اس مسجد کی تعمیر کے فوراً بعد لاہور کا قصد کیا اور خاص کر اس سے پیشتر اس نے حافظ رحمت خاں کو پہلے ارسال کر دیا کہ وہ لاہور پہنچ کر جشن میلاد النبیؐ کا خاطر خواہ انتظام ماہ ربیع الاول ۱۰۸۶ھ میں کرے۔ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ در اصل یہ مسجد کا افتتاحی جشن تھا چنانچہ بادشاہ نے یہاں سے حسن ابدال کا رُخ کیا۔ اور بادشاہ اپنے ہمراہ یہاں سے فدائی خاں کو بھی حسن ابدال برائے فوجی انتظام لے گیا تھا۔ اور واپسی پر بادشاہ پھر لاہور میں باغ فیض بخش شالامار میں ٹھہرا اور اس اثنا میں عیدالاضحیٰ کا موقع تھا۔ بادشاہ نے اس مسجد میں عید کی نماز ادا کی۔ اس سے پیشتر یہ انتظام کیا گیا تھا کہ مولانا عبداللہؒ بن مولانا عبدالحکیمؒ سیالکوٹی نماز الاضحیٰ پڑھائیں۔ انھیں خاص طور پر یہاں لاہور میں اس فریضہ کے لیے بلایا گیا تھا۔ ادائے نماز کے بعد انھیں اسی موقع پر خلعتِ فاخرہ، ایک لاکھ نقدی اور ایک ہاتھی عنایت کیے گئے۔ مولانا عبداللہؒ کا انتقال سیالکوٹ میں ۱۰۹۴ھ میں ہُوا۔

نماز ادا کرنے کے بعد جب شاہی سواری جامع مسجد لاہور سے واپس ہو رہی تھی تو بادشاہ تختِ رواں سے اُتر کر کشتی میں سوار ہو رہا تھا تو کسی بدبخت شوریدہ سر نے جو گرو تیغ سنگھ کا چیلہ تھا، دو اینٹیں پھینکیں۔ ان میں سے ایک تختِ رواں پر گری۔ پیادہ جلو نے اس بدنصیب کو پکڑ کر گرفتار کر کے کوتوال کے حوالے کر دیا۔ (مآثر عالم گیری مطبوعہ حیدر آباد دکن اردو ترجمہ صـ ۱۰۴)

تفصیل تعمیر مسجد

حصہ دوم

عمارت کا مصالح

عام لوگوں کے نزدیک مسجد بادشاہی ظاہرہ طور پر محض سُرخ پتھر کی تعمیر شمار ہوتی ہے کیونکہ ہر طرف یہی نظر آتا ہے اور یہ دیکھنے والا بھی اسے حقیقت ہے۔ یہ سُرخ پتھر جسے تاریخ میں سنگِ خارہ بھی لکھا ہے، آگرہ کے قُرب و جوار میں فتح پور سیکری و بیانہ کے علاقہ سے لایا گیا تھا۔ مگر فنِ تعمیر کے اعتبار سے ان سرخ سلوں کے نیچے تمام عمارتِ مسجد چُونہ اور اینٹوں سے فنِ تعمیر کے صحیح اصولوں پر تیار ہوئی ہے اور اس میں تنوّع یعنی یکرنگی دُور کرنے کے لیے اکثر جگہ سُرخ پتھر کی سطح پر منبّت کاری اور سفید سنگِ مرمر سے پرچین کاری بھی کی گئی ہے۔ یہ سفید سنگِ مرمر جو بادشاہی مسجد کی تمام عمارت پر لگایا گیا ہے، مقام مکرانہ ریاست جودھپور سے لایا گیا تھا۔ اس طرح اس عمارت مسجد کو زیادہ حسین بنا دیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مسجد کے گنبد سفید سنگِ مرمر کی بھاری سلوں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ویسے مسجد میں دیگر انواع کے نقش و نگار بھی ہیں۔ ہم ان کو الگ اسی عنوان "زیب و زینت" کے تحت بیان کریں گے۔ اگرچہ موجودہ مرمت سے کسی قدر پرانی روایات مصالح میں فرق بھی آگیا ہے۔

معائنۂ عمارت سے واضح ہوجاتا ہے کہ شاہجہانی اینٹوں سے اس مسجد کی معماری کی گئی ہے یعنی یہ اینٹیں پیمائش کے اعتبار سے کسی قدر شکل میں مربّع نما تقریباً دس انچ ضلع کی ہوتی تھیں، ان کو نہایت عمدگی سے زیادہ مقدار چُونہ سے جوڑا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ عمارت بدستور کھڑی ہے۔ عمارت کے اس مصالح سے متعلق بعض لکھنے والوں نے جنھیں تاریخ سے تعلق نہیں ہے، بیان کیا ہے کہ اس مسجد پر وہ تمام مصالح استعمال ہوا ہے جسے شہزادہ داراشکوہ نے حضرت میاں میر صاحبؒ کے روضہ کی تعمیر کے لیے یہاں جمع کیا ہوا تھا، جو شہزادہ مذکور کے پیر و مرشد تھے۔ مَیں اِسے صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ حضرت میاں میر صاحبؒ کا انتقال لاہور میں ۱۰۴۵ھ میں ہُوا، جو شاہجہان کے عین شباب کا زمانہ تھا، اور مسجد کی تعمیر ۱۰۸۴ھ میں ہوئی۔ داراشکوہ کا خاتمہ ۱۰۶۹ھ میں ہُوا، یعنی تعمیرِ مسجد سے ۳۹ سال تک روضہ تعمیر ہی نہیں ہُوا تھا۔ یہ محض ایک قیاس ہے، اس مصالح کو روضہ حضرت میاں میر صاحبؒ سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اپنے وقت پر بعہد شاہجہان تعمیر ہوگیا تھا۔ بلکہ اس روضہ کے قریب باہر روضہ نادرہ بیگم زوجہ داراشکوہ آج بھی کھنڈرات میں موجود ہے، جو قریب بزمانۂ شہنشاہیت اورنگ زیب خواجہ مقبول کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوا تھا اور یہی شخص مرحومہ کی لاش کو سندھ سے یہاں لایا تھا اور اس سے قبل اسی شخص نے لاہور میں ایک مسجد بھی ۱۰۶۰ھ میں تعمیر کی تھی جسے لوگ غلطی سے دائی انگہ کی مسجد بیان کرتے ہیں حالانکہ اس کا اپنا نام بھی اس مسجد پر لکھا ہے۔ نادرہ بیگم کا روضہ واقعی ایک شاندار عمارت پانی کے تالاب میں واقع تھی۔

مسجد کا صدر دروازہ

یہاں شائع شدہ پلین مسجد اور جائے وقوع کا نقشہ واضح کرتے ہیں کہ یہاں جائے وقوع کے نشیب و فراز کو مدِّنظر رکھ کر مسجد کا صدر دروازہ محض ایک ہی مشرق کے رخ رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مسجد کے جنوب میں بھی ایک معمولی ساضمنی چھوٹا سا دروازہ ابتدا سے تھا جس کے بعد اس کے ہمراہ ویسے ہی اور دروازے بھی بعد میں قائم کر دیے گئے ہیں۔ یہ صدر دروازہ سطحِ زمین سے خاصا بلند ہے، جس کی وجہ سے اس مسجد کی ظاہری عظمت میں اضافہ بھی ہوگیا ہے۔ قریب اکیس سیڑھیاں چڑھ کر چبوترہ تک پہنچتے ہیں۔ یعنی اس طرح یہ صدر دروازہ عام زمین سے تقریباً تیس فٹ بلند ہے اور یہ قلعہ لاہور کے مغربی دروازے کے عین سامنے ہے۔ اور دیگر مغل شاہی عمارات کے دروازوں کی روایت پر ہے۔ تعمیری طور پر یہ صدر دروازہ اپنے ماتھے پر اور عقب میں دو نصف گنبدوں' اور ساتھ ہی درمیان میں پورے گنبد پر مشتمل ہے یعنی یہ بذاتِ خود ایک مکمل شاہانہ عمارت ہے۔ یہ مربّع مکعب دو منزلہ عمارت بحیثیت رہائش گاہ برائے خطیب یا امام اور ساتھ ہی مکتب اور کتابخانہ کے مطالب کو پورا کرتی ہے۔ اس کا ماتھا اور عقب قریب قریب ایک جیسے ہیں، سوائے اس کے کہ باہر مشرق کی طرف کمان کے اوپر مسجد کا تاریخی کتبہ آویزاں ہے جسے ہم اوپر درج کر چکے ہیں اور اس کے کناروں پر بُرجیاں اور دیگر کنگرے ہیں پتھر پر منبت کاری اور اندر گنبد پہ عام آبی رنگوں میں نقاشی بھی کی گئی ہے۔ یہ گنبد نصف کروی ہے۔ بڑی کمان کے کونوں پر سنگِ مرمر میں شمسے آویزاں ہیں اور کھڑکیاں بھی ہیں جن سے اندر روشنی اور ہَوا باقاعدہ پھرتی ہے۔ اس کے اندر بطور مکتب برآمدے بھی ہیں۔ فنِ تعمیر شاہانہ میں صدر دروازے بہت حیثیت رکھتے ہیں، جیساکہ اس دروازے سے بھی واضح ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے سامنے فتحپور سیکری میں اکبری مسجد کے بلند دروازہ سے عیاں ہے جو مقام کی کیفیت کے اعتبار سے عمارت کے جنوب کی طرف ہے اور دہلی میں جمعہ مسجد کے تین دروازے ہیں جو سہولت و عمدگی سے بنائے گئے ہیں تاہم یہ ہمارے سامنے واضح حقیقت ہے کہ یہاں بادشاہی مسجد میں یہ صدر دروازہ اس کے مشرق کی طرف نہایت موزوں عمارت

اس ماحول میں ہے۔

مسجد کا فرش اور پانی کا انتظام

ہم اس صدر دروازہ مسجد سے گزر کر اندر وسیع صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں جس کا فرش دروازہ کے چبوترہ سے تقریباً ساڑھے سات انچ بلند ہے جو آج قریب قریب تمام مربع سنگِ سُرخ کی سلوں سے آراستہ ہے، جو موجودہ انتظام مرمت مسجد نے لگایا ہے، ورنہ اس سے قبل یہ تمام فرش بصورت مصلّے نماز صفوں میں آراستہ تھا تاکہ بوقت جماعت خود بخود ہر نمازی صفوں میں کھڑا ہو جائے اور ان قدیم صفوں کے مصلّوں کے حاشیے سیاہ سنگِ موسٰی سے آراستہ تھے اور یہ تمام ماحول صحن مسجد میں بچھا ہوا تھا۔ اس تمام فرش میں قریب چھ انچ معمولی سی شمال کی طرف ڈھلوان بھی دی گئی ہے تاکہ بارش یا حوض کا پانی بآسانی پتھروں سے نیچے چلا جائے جو اس وسیع فرش پر نظر آتے ہیں اور ان کے نیچے یہ تمام پانی ایک جگہ اکٹھا ہو کر شمال کی طرف باہر دریا میں جا گرتا تھا اور آج بھی قائم ہے۔ اگرچہ مسجد کے صحن کے درمیان وضو کے لیے ایک وسیع مربع حوض ہے جس کا ضلع پچاس فٹ ہے اور یہاں سے ذرا آگے مسجد کا فرش قریب ڈیڑھ فٹ اوپر دو زینوں سے بلند ہو جاتا ہے اور یہ حصّہ آخر اوپر ایوانِ مسجد تک پہنچ جاتا ہے۔ یعنی درمیان میں ایک مزید شوکت پیدا ہو جاتی ہے جس پر ہم نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علّامہ اقبال کی نمازِ جنازہ مولوی غلام مرشد خطیب مسجد بادشاہی کی اقتداء میں ادا کی تھی۔ ایوان کے اندر محراب ہے اور اسی حصّہ سے تمام مسجد کی شان و شوکت اور عظمت وابستہ ہے۔ ویسے باہر نیچے کے فرش سے یہ حصّہ ایوان قریب پانچ فٹ بلند ہے۔ یہ حصّہ ایک پختہ اور پختّہ کرسی تصوّر کرنی چاہیے جسے اس موجودہ مرمت مسجد میں از سرِ نو سنگِ مرمر کے مصلّوں کے فرش سے آراستہ کیا گیا ہے مگر اس کا ازارہ ابری دار پتھر کا ہے، اور دیواروں پر پختہ پلستر کی تہہ دی گئی ہے جس پر نقاشی ہے۔ اس ایوان میں محراب کے ہمراہ منبر کو از سرِ نو بجلی کے جدید انتظام کی وجہ سے مرتّب کیا گیا ہے اور اسی حصّہ کے اوپر تین خوبصورت بلند دہرے گنبد کھڑے ہیں اور درمیانی دہرا گنبد دوسروں سے بہت زیادہ بڑا ہے۔

عام طور پر مسجد میں آنے والا ہر آدمی اپنے دل میں سوچتا ہے کہ اتنی بڑی مسجد کے لیے پانی فراہم کرنے کا کیا انتظام ہے اور حوض کیسے بھرتا ہے اگرچہ ہم نے ہمیشہ میونسپل کارپوریشن کے نلکے کو ہی حوض پر دیکھا ہے مگر تحقیق سے معلوم ہوگا کہ مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں باہر ایک قدیم زمانے کا بہت بڑا کنواں ہے جسے اگرچہ آج ٹیوب ویل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ غرضیکہ اس کے ذریعے مسجد کا حوض بھر دیا جاتا اور دیگر ضروریات، پانی کو اسی کے ذریعے پورا کیا جاتا تھا اور چرسہ اس کنویں کے ساتھ قائم تھا۔ اگرچہ یہ قدیم انتظام آج موجود نہیں ہے غرضیکہ تمام پانی اکٹھا ہو کر نیچے نیچے فرش مسجد خود بخود شمال کی طرف چلا جاتا تھا اور آج بھی یہی انتظام ہے۔

دالان

مسجد کا وسیع صحن چاروں طرف باستثنا قبلہ دیوار کے سر بسر یکساں طرز کے دالانوں سے آراستہ ہے جو سطح سے تقریباً اکیس فٹ بلند ہیں اور ان کی بیٹھک تین فٹ بلند سر بسر ہے۔ ان پر اسی طرح اوپر چاروں طرف کنگرے دار منڈیر ہے اور اندر تیرہ فٹ چوڑے ہیں۔ بدقسمتی سے جب مسجد کو انگریزوں نے مسلمانوں کے حوالے ۱۸۵۶ء میں کیا تھا تو مشرق کی طرف کے دالانوں کو گرا کر دیا تھا تاکہ مسجد کے اندر کے حالات کا بخوبی قلعہ کی دیواروں سے دیکھا جا سکے جو انگریزوں نے اس وقت بطورِ مصلحت کیا تھا۔ اس حصّہ مشرق کے دالانوں کو پھر اب پاکستان کے

کے ظہور میں آنے کے بعد از سرِ نو بنا دیا گیا اور ان کے ہر دو طرف یعنی دائیں اور بائیں وضو کا انتظام کر دیا گیا ہے جو مسجد کی اصل تعمیر میں نہ تھا اور بانی مسجد کے سامنے ان کا تصوّر بھی تھا۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ان دالانوں کا اوپر کا منڈیر ایک یکساں چاروں طرف کنگروں کی صورت میں جن کی شکل باصطلاحِ معماری مداخل کہلاتی ہے۔

مسجد کے کماندار طاق

یہ تمام عمارت مسجد معماری کے کماندار اصولوں پر مبنی ہے اور ان کمانوں کی پرکار بالکل یکساں ہر طرف نظر آئے گی۔ مگر یہ کمانیں تمام مرغولہ دار ہیں جن کو کمانِ شاہجہانی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ طرزِ تعمیر زیادہ تر شاہجہان کے عہد میں اختیار کی گئی تھی جس کا صحیح مظہر ہمیں آگرہ اور دہلی کی عماراتِ شاہجہان سے ملتا ہے۔ اگرچہ تاریخی طور پر جیسے محقق سٹیتھم نے ظاہر کیا ہے کہ یہ زیادہ معقول امر ہوگا کہ ان کو ہم فرض کر لیں کہ یہ عربوں کی اختراع ہے جو صدیوں تک اہلِ یورپ کے علم میں نہیں تھی۔ جن کو اوّل مسلمانوں نے وسط ایشیا اور ایران کی عمارات میں اختیار کیا۔ جہاں سے مسلمان اس طرز کو ہندوستان لے گئے۔ اور اس وقت یہ طرز عام رواج پا گئی اور سترہ صدی سے مغل فن کار اسے مرغولہ صورت میں بروئے کار لائے اور عہدِ شاہجہانی کا طرۂ امتیاز بن کر اپنے معیار پر پہنچ گئی۔ مگر یہ معلوم ہوگا کہ نوکدار کمانوں کا استعمال اسلامی عمارات میں ایک تقدّس سمجھا گیا اور اسی پر ان کو اصرار ہے کہ یہ اسلامی ممالک میں خصوصیّت بن گئی۔ بادشاہی مسجد لاہور میں یہ یکساں طرز کمان صدر دروازہ سے لے کر اخیر محراب تک بالکل یکساں نظر آتی ہے۔

مسجد کے عقبی قبلہ دیوار طرف کعبہ ایک خصوصیّت رکھتی ہے کیونکہ اسی میں محراب ہے جو مسجد کی روح ہے۔ یہاں ایک لفظی خصوصیت کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔ اس حصّۂ مسجد کو عربی کتابوں میں "الایوان" لکھا ہے اور اکثر استعمال کی وجہ سے اکثر اوقات اسے بعض یورپی مصنّفین نے "لیوان" بھی لکھا ہے جو غلط ہے۔ اسی میں مسجد کی محراب ہے اور کماندار ماحول نظر آئے گا۔

ایوان کا ماتھا یا پیشانی

اس مسجد کی عظمت دیکھنے والے کو صحن میں اندر داخل ہو کر مسجد کے ایوان کی مرکزی پیشانی زیادہ متحیّر کرتی ہے۔ اسے انگریزی میں فرنٹن (FRONTON) کہتے ہیں اور بعض لکھنے والوں نے اسے "درگاہ" بھی لکھا ہے۔ اس کی مرکزی اونچائی اسّی فٹ اور چوڑائی پچپن فٹ ہے۔ اس میں مسجد کے ایوان کی بلند درمیانی کمان جس کے ہر دو جانب خوبصورت چاروں کونوں پر بُرجیاں ہیں اور درمیانی کمان کے کونوں پر پرچین کاری میں سفید مرمریں گل بوٹے ناظر کو متوجہ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس کمان کے نیچے اندر کے رُخ اُبھرے ہوئے نقوش میں بیل، سربسر مرمریں گل بوٹوں میں چلی گئی ہے اور یہ کمان نہایت عمدگی سے نصف گنبدی طرز پر قائم کی گئی ہے۔ پھر اس کے آگے اندر داخل ہونے والی کمان کی چوکھٹ کے ماتھے پر کلمۂ طیّبہ سفید پتھر پر کھود کر سیاہ پتھر میں بھر دیا گیا ہے۔ یہ تمام نقش و نگار کسی قدر عجوبہ روزگار نظر آتے ہیں۔

ایوان مسجد

اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے حضرات اس مسجد کے ایوان کا بغور مطالعہ کریں اور اگر موقع ملے تو یہ بھی مشاہدہ کرنا چاہیئے تاکہ تعمیر کرنے والے

ماہرین کی لیاقت اور فنِ تعمیر کی گہرائیوں کا صحیح حظ اُٹھایا جا سکے، کیونکہ مسجد کا تمام حُسن اور کشش اسی ایوان پر موقوف ہے اور سب سے بڑھ کر اسی حصّہ مسجد پر شریعتِ اسلام کا بھی اطلاق ہے۔ اس ایوان میں دو حصّے ہیں یعنی دُہرا ایوان ہے اور بیچ میں دیوار ہے —— اور اس حصّے کے سامنے والے حصّے کو دائیں اور بائیں درمیانی درگاہ کو چھوڑ کر پانچ پانچ طاقوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر اسی ترتیب سے پچھلے یعنی بڑے حصّے کو تقسیم کیا ہے اور اس پر تین بلب نما گنبد کھڑے ہیں جبکہ درمیانی گنبد زیادہ بڑا اور بلند بھی ہے جو درمیانی مربع حصّہ سے واضح ہے اور یہ گنبد قُطری کمانوں پر قائم ہیں اور ان گنبدوں کے درمیانی قلبوتی نظام کو معمار لوگ چشمہ کہتے ہیں غرضیکہ یہ تمام نظام ایک منظومیت پیش کرتا ہے۔ اسی حصّہ میں محراب و منبر ہیں جن کو ہم الگ بیان کرتے ہیں اور اس ایوان کے شمالی و جنوبی اطراف میں الگ راستے ہیں۔ ان سیڑھیوں کے ذریعہ اِدھر سے ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔

محراب و منبر

یہ شعر عام طور پر مشہور ہے ؎

چراغ و مسجد و محراب و منبر
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

اس شعر میں بہت کچھ مضمر ہے۔ بہرحال مسجد کے لیے محراب و منبر کا ہونا لازمی ہے کسی موقع پر یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ یہ مسجد کی روح ہیں۔ خاص کر اس مسجد کا درمیانی مربع حصّہ جہاں منبر و محراب میں بہت ہی خوبصورت تمام سنگِ مرمر کا ہے اور تمام ازارہ ابری پتھر کا ہے۔ پھر اس حصّہ کے تمام حواشی کو نقش و نگار سے بھی آراستہ کیا ہے۔ مگر موجودہ منبر در اصل حال ہی کی تعمیر ہے کیونکہ اس کے نیچے بجلی کا بڑا سوئچ بھی قائم کر دیا گیا ہے اور میرے سامنے موجودہ منبر از سرِ نو قائم کیا گیا ہے۔ ویسے تاریخ میں اکثر مساجد کے منبر لکڑی کے بھی بنائے گئے ہیں۔ ان میں مسجد قیروان کا منبر بہت مشہور ہے اور مصر کے عجائب خانہ اور لندن و استنبول کے عجائب خانوں میں بھی لکڑی کے منبر محفوظ ہیں۔

گنبد

مسجد بادشاہی کو دُور سے متوجہ کرنے والے اس کے ایوان کے اوپر سفید سنگِ مرمر کے تین بلند گنبد ہیں اور درمیانی گنبد زیادہ بلند اور زیادہ بڑا بھی ہے۔ آج تک مہندس اس درمیانی گنبد کو پرکار کے احاطے میں لانے سے قاصر ہیں اور یہ ہر سہ گنبد اندر سے دوہرے ہیں اور ان کے بلند گردنے ۱۸ فٹ اور ۲۱ فٹ بلند اندرونی طور پر قُطری کمانوں کے نظام پر قائم ہیں۔ ان گنبدوں کے درمیان باقاعدہ محرابی و کمانی نظام پر چشمے قائم ہیں اور ان کا تعلق دوسری باہر کی کمانوں سے بھی ہے جس وجہ سے یہ تمام ایوان ایک نہایت مربوط اور منظم عمارت ہے۔ گنبدوں پر سنہری کلس دُور سے چمک اُٹھتے ہیں اور اُن کو اُلٹے ہوئے کنول کے پھول پر اس طرح قائم کیا ہے کہ واقعی غور سے دیکھنے سے وہی کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے، ان دوہرے گنبدوں کے اندر خلا ۳۰ فٹ × ۲۲½ فٹ ۳۹½ × ۴۳½ فٹ الگ الگ ہے جن سے یہ گنبد کافی بلند ہو گئے ہیں اور ان سے مسجد کے ایوان کے محراب سے پیدا ہونے والی آواز کو بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ غرضیکہ سائنس کے اصولوں پر قائم ہیں اور شکل میں بلب نما امرود کی شکل کے ہیں۔

یہ یہاں بیان کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے ہی ہندوستان بھر میں گنبد کا اوّل صحیح استعمال کیا اور تاریخ میں بیان ہے کہ مسجد قوۃ الاسلام دہلی پر

اعلائے گنبد تھے جسے امیر خسروؒ نے "قران السعدین" میں بیان کیا ہے اور یہ مسجد یہاں ۵۸۷ ھ میں تعمیر ہوئی تھی مگر اس کے قریب ایک صدی بعد علاء الدین خلجی نے پھر جب جماعت خانہ اور اس مسجد کا الگ دروازہ بنائے تو ان گنبدوں کو نہایت وضاحت سے قائم کیا مگر دوہرا گنبد بھی یہاں ہندوستان میں قریب نویں صدی ہجری کے اخیر دہلی میں قائم ہو گیا تھا۔ اور اسی خصوصیت کو ہمایوں کے مقبرے میں ذرا مزید وضاحت سے بروئے کار لایا گیا۔ لاہور میں اس قسم کا قدیم ترین گنبد حضرت عبدالرزاق رح کا آج "نیلا گنبد" کے نام سے مشہور ہے جو ۹۵۷ھ میں تعمیر ہوا۔

مینار

اس مسجد بادشاہی کا نمایاں پہلو اس کے چار سرخ پتھر کے مینار اس کے چاروں کونوں پر آج بھی موجود ہیں جن کو باقاعدہ اصلی حالت پر مرمت کرایا گیا ہے اور دور سے نظر آتے ہیں۔ فنِ تعمیر عالم میں "مینار" کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، خاصکر اس حقیقت کو لکھنے والے فراموش کر دیتے ہیں کہ مینار کی ابتدا اور بنا اوّل اسلام میں ہوئی جب مسلمانوں نے مساجد میں اذان بلند مقام سے دینے کی ضرورت محسوس کی، تاکہ لوگ عمدگی سے سُن لیں۔ اسی غرض سے مسجدِ نبوی میں اوّل مرتبہ مئذنہ یا مینار ۸۹ ھ کے بعد آگیا تھا۔ جب خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حکم سے مسجدِ نبوی کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا تھا، اس کے بعد اس میں کئی تبدیلیاں بھی ہوئیں، حتیٰ کہ عمارتی خوبصورتی کے تحت اسے مسلمانوں نے اپنے مقبروں کے چار کونوں پر بھی بنایا یعنی "مئذنہ" اذان دینے کے مقام کو عمارت کے حُسن کا بھی حصہ بنا دیا گیا۔ بادشاہی مسجد کے مینار ہشت پہلو سطح پر زمین سے قریب بیس فٹ بلند شروع ہوتے ہیں اور اس کے اوپر تین منزلیں الگ ہیں اور ان کی اونچائی ۱۴۳½ فٹ ہے۔ بُرجیاں جو از سرِ نو مرمت میں قائم کر دی گئی ہیں، الگ ہیں۔

مسجد کی بڑی بڑی پیمائشیں

مسجد میں داخل ہونے کے لیے سیڑھیوں کے چبوترے پر ہم پہنچتے ہیں جو ۷۶ فٹ لمبا اور ۳۴ فٹ چوڑا ہے۔ صدر دروازہ قریب قریب مربع ہے جس کا ضلع ۶۵ فٹ ہے جو ایک طرح رہائشی مکان نما ہے اور دو منزلہ عمارت ہے۔ کبھی یہاں مسجد کا کتبخانہ بھی تھا۔ اگرچہ آج یہاں تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کا صحن جیسا کہ شائع کردہ پلین سے واضح ہے، تقریباً مربع شکل کا ہے یعنی اس کا ضلع ۵۲۸ فٹ ہے۔ مسجد کا ایوان یعنی محراب والا حصہ جو مسقف ہے مغربی دیوار تک ہے جس کی کُرسی قریب دو گز بلند ہے۔ ۲۲۷ فٹ طویل اور ۱۵ فٹ عریض ہے مگر اس ایوان کے آگے جو صحن کا ذرا بلند حصہ ہے، چوڑائی میں ۱۵۰ فٹ اور درمیان میں اپنے دائیں اور بائیں پہلو سے ذرا بلند ہے یعنی اس حصہ سے مسجد میں ایک خوبصورتی بھی بطورِ عظمت دُگنی ہے۔ حوض کا ضلع ۵۰ منٹ ہے۔ ان بڑی بڑی پیمائشوں کی موجودگی میں اگر ہم ذرا حساب لگائیں تو معلوم ہوگا کہ بآسانی پچھتر ہزار سے زائد نمازی بیک وقت جماعت باامام ادا کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے لاہور کے لوگ اسے بطورِ عیدگاہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس مسجد سے قبل مغل مساجد یعنی آگرہ، فتحپور سیکری اور دہلی میں تعمیر ہو چکی تھیں جو اس مسجد سے کافی چھوٹی ہیں۔

مسجد کی زیب و زینت (نقش و نگار)

مسجد کا مشاہدہ دیکھنے والے کو واضح کرتا ہے کہ تین چار انواع نقش و نگار اپنی فنی کیفیت سے اپنی طرف متوجہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اوّل

عام پتھر پر منبّت کاری، دوم پتھر کی سطح کو کھود کر ان کو اس کُھدی ہُوئی جگہ پر کسی دوسرے رنگ کے پتھر کو بصورتِ نقش و نگار بھر دیا گیا ہے۔ تیسری قسم پتھر کو کھود کر بصورتِ نقش و نگار بھر کر ان کو سطح سے کسی قدر اُبھرا ہُوا رکھا ہے۔ چوتھی نوع نقش و نگار بصورت پھول بوٹے سفید پلستر یعنی استر کاری پر کیے گئے ہیں۔ ان انواع کو ہم ذیل میں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔

تاریخی حیثیت سے ہمیں علم ہے کہ سب سے اوّل مسجدِ نبوی مدینہ منورہ کی دیواروں پر الفسیفساء (موزیک) سے ۸۹ھ میں نقش و نگار کیے گئے۔ جب خلیفہ اموی ولید بن عبد الملک نے مسجدِ نبوی کو مکمل طور پر از سرِ نو تعمیر کیا تھا یعنی بازنطینی اور ساسانی طرز کے قدرتی بیل بوٹوں کو رسمی طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس ابتدائی عہدِ اسلامی کے اسی طرز کے بیل بوٹے جامع اموی دمشق میں آج بھی موجود ہیں جسے اسی خلیفہ ولید نے ہی تعمیر کیا تھا۔ مگر یہاں بادشاہی مسجد میں نقش و نگار مُختلف ہیں جن کو مختصر طور پر ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) یہاں لاہور میں ایوانِ مسجد بادشاہی کا درمیانی مربّع حصّہ جس میں محراب و منبر ہیں، نہایت دیدہ زیب تمام سفید سنگِ مرمر میں مرغولہ دار کمانوں، طاقچوں اور محرابوں پر مبنی ہے۔ اکثر یورپی محققین نے اس حصّۂ مسجد کو بوجہ اہمیت کے "درگاہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور مسجد کا قلب بھی یہی ہے۔ یہیں امام اپنا خطبہ پڑھتا ہے، یہیں قراءت کرتا ہے اور امامت کرتا ہے۔ اس مسجد کے اس حصّے کے بنانے میں اسے زیادہ موزوں اور مرصّع کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اس میں کئی قسم کی بیلیں سفید سنگِ مرمر پر منبت کی ہوئی ہیں جن میں پتّے، پھول وغیرہ منظم طریق پر بنائے گئے ہیں اور غور سے مشاہدہ اور مطالعہ واضح کریگا کہ "پتّے" کی ہیئت زیادہ تر رومن اکنتھس طرز پر بنائی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے مختلف ہے اور اس میں تاریخ قدیم، عہدِ متوسط اور جدید شامل ہیں خاص کر درمیانی گنبد کے گردہ کے قریب جہاں قُطری کمانیں ہیں نہایت حسین بنا دیا ہے اور الفاظ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے محض مشاہدہ ہی کافی اور اس سے جو حظ اٹھایا جاتا ہے، وہ بہت ہی گرانقدر ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے ابتدا میں قُبّۃ الصخرہ یروشلم میں ان نقوش کو استعمال کیا تھا اور یہاں ایک روایتی مشابہت ضرور ہے اور اسلامی طرزِ استعمال کی وجہ سے بھی بالکل مختلف ہے۔ بعض جگہ سطح کو بیشمار مربّع و مستطیل میں تقسیم کر دیا ہے اور ان کے اوپر کے حصّوں کو مرغولہ کی صورت دے دی ہے جس سے ان کی ہیئت اسلامی ہو گئی ہے۔ یہی سادہ منبت کاری یہاں ہم عام سُرخ پتھر کی سلوں پر بھی ہر طرف دیکھتے ہیں اور ہر مربّع یا مستطیل سل کو اس طرح منقّش کیا گیا ہے کہ بذاتِ خود ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی ان نقوش کا حسین پہلو ہے جسے ہم الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑھ کر ان تمام پتھر کی سلوں کے حاشیے خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ بہرحال اس منبت کاری نے ہر طرف ایک عام صاف سطح پتھر کو دلکش بنا دیا ہے۔ مشاہدہ کرنے والوں کو چاہیے کہ بغور مطالعہ کریں۔

(۲) یہ ایک حقیقت ہے کہ مسجد کی دیواروں کو سُرخ پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جن پر بعض جگہ نہایت اعلیٰ طریقے سے کھود کر ان میں سفید سنگِ مرمر کے نقش و نگار کو بھر دیا ہے جسے ہم اس طریقۂ کار کی وجہ سے پرچین کاری کہتے ہیں، اس سے ایک تنوّع اور دلکشی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی اوّل شہادت یہاں ہمیں مسجد کے مشرقی صدر دروازہ کے باہر ماتھے پر مسجد کے کتبۂ تاریخی سے ملتی ہے اور جہاں سیاہ مرمر کے حروف کو سفید سنگِ مرمر کی سطح پر بھر دیا ہے۔ اگرچہ دُنیا میں اس طرز کا کمال مقبرۂ جہانگیر لاہور اور تاج محل آگرہ میں کئی رنگوں کے پتھر سے پیدا کیا ہے۔

(۳) متذکرہ بالا کے علاوہ نقوش کو سُرخ پتھر کی سطح پر کھود کر اسی طرح کے سفید مرمر کے نقوش کو کاٹ کر ان میں بھر دیا ہے اور ان کو کسی قدر اُوپر اُبھرے ہُوئے ہم دیکھتے ہیں، یعنی وہی متذکرہ بالا طریقہ پرچین کاری ہے مگر ذرا ایک قدم آگے نظر آتا ہے۔ یہ طرز آج تک اس مسجد کے علاوہ کہیں کسی مغل یا دیگر اسلامی یا غیر اسلامی عمارت میں نہیں ملتی۔ اس بادشاہی مسجد میں اس ضمن میں یہ بہترین مثال مسجد کے ایوان کے ماتھے کی بڑی کمان

کے کونوں پر اور اسی کمان کے اندر اس کمان کا گرد اہے، یہاں ایک خاص بیل سر بسر تمام محراب پر چلی گئی ہے جو اس قدر دیدہ زیب ہے کہ انسان متحیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم یہاں اس کے نقش کو پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کی بیلیں ہمیں بعض دور احیان کے اطالوی فنکاروں کی تصاویر میں بھی ملتی ہیں مگر یہاں یہ نقش و نگار ان سے بدرجہا اعلیٰ، ارفع اور مختلف نہایت منظم طریق پر سنگِ مرمر میں کاٹ کر بھر دیے ہیں اور یہی طرز اس مسجد میں بعض طاقچوں کے مرغولوں پر بھی ہے اور اسی طرز میں بعض جگہ محرابوں اور کمانوں کے کونوں میں شمسے بھی سنگِ مرمر کے کاٹ کر بھر دیے ہیں۔ اس ضمن میں مسجد کے ماتھے کا مشاہدہ لازمی ہے۔

(۴) اسی طرح اس مسجد کے صدر دروازہ کے اندر و مسجد کے ایوان کے اندر دیواروں اور گنبدوں کے اندر تمام پلستر کیا ہوا ہے یعنی اس سفید استر کاری پر مختلف آبی رنگوں میں نہایت موزوں اور منظم نقش و نگار کیے گئے ہیں جن کے بعض اہم نمونے ہم یہاں شائع کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام نقش و نگار ایک طرح قدیم اصل پلستر اور نقاشی کا احیاء ہیں جو ۱۸۵۶ء کے بعد کیے گئے جب یہ مسجد قریب صدی کے بعد مسلمانوں کو ملی تھی کیونکہ نہ تو ان کو موجودہ سرکاری مرمت کے دوران از سرِ نو کیا گیا اور نہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جب انسان ان کا مشاہدہ کرتا ہے تو ایک فرحت محسوس ہوتی ہے۔ ہر آدمی جو یہاں آتا ہے ان کے مشاہدہ سے سرشار ضرور ہوتا ہے۔

غرضیکہ ان تمام متذکرہ بالا انواع نقش و نگار کو ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ مشاہدہ کرنے والا مسجد کے اس پہلو کا نہایت متانت اور اطمینان سے مشاہدہ کر کے ایک حظ محسوس کرتا ہے اور ایک خاموش آرزو اپنے ساتھ لے جاتا ہے کہ ایک بار پھر ان کا مشاہدہ کروں گا۔ یعنی انسان اُن سے اُکتاتا نہیں۔ اور یہی ان نقش و نگار کا مقصد ہے۔

مسجد بحیثیتِ عیدگاہ

بادشاہی مسجد لاہور کا رقبہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار پانچ سو (۳,۶۴,۵۰۰) مربع فٹ ہے۔ جو ایک طرح وسیع میدان ہے اور اس مسجد کو ابتدا سے ہی سب سے بڑی مسجد سمجھ کر اس لیے بھی تعمیر کیا گیا تھا کہ ضرورت کے وقت یہ عیدگاہ کا بھی کام دے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے عیدگاہیں بھی مساجد کی طرح عموماً شہر کے باہر تعمیر کی ہیں اور ان کو تاریخ میں "نمازگاہ" یا "مصلّےٰ" بھی لکھا ہے۔ تاریخ اسلامی کا یہ ایک دلچسپ باب ہے کہ ہم اسلامی دُنیا کی مشہور عیدگاہیں یہاں بیان کریں۔ بہر حال یہاں اشارہ کافی ہے مگر پاک و ہند میں سب سے بڑی عیدگاہ آگرہ کی شمار ہوتی ہے جسے شاہجہان نے خود تعمیر کیا اور اس کی لمبائی ۷۰۰ فٹ اور چوڑائی ۵۲۰ فٹ ہے۔ اسی طرح دہلی میں پہاڑ گنج میں عیدگاہ ہے مگر وہ اتنی بڑی نہیں ہے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آگرہ کی عیدگاہ اور لاہور کی اس بادشاہی مسجد کی لمبائی اور چوڑائی قریب قریب برابر ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جب لاہور میں اس مسجد کی بنا رکھی گئی تھی تو آگرہ کی عیدگاہ عہدِ شاہجہانی بھی مدِ نظر تھی اور آگرہ میں عیدگاہ کا ایوان بھی مختصر سا ہے جس میں باقاعدہ محراب نہیں ہے نہ یہ تکلفات ہیں۔ مگر لاہور میں اس سے قبل بھی چند عیدگاہیں تھیں جو اگرچہ بادشاہی مسجد کی تعمیر کے بعد قریب قریب لوگوں کی یاد سے نکل گئیں اور اسے یہاں جہانگیر کے عہد کی ایک خوبصورت عیدگاہ تھی جسے ریلوے کے انتظام میں ضائع کر دیا گیا اور آج قدیم ترین عمارت لاہور میں ایک قدیم عیدگاہ "چاہ میراں" کے رقبہ میں خواجہ سعید کے قریب محض ایک محراب باقی ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ انند رام مخلص نے اپنی تالیف بدائع و وقائع میں بیان کیا ہے کہ حیات اللہ خان نے اس میں پناہ لی تھی جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور کا محاصرہ تھا۔

بہر حال ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہ بادشاہی مسجد ہمیشہ بطورِ عیدگاہ استعمال بھی ہوتی ہے اور اہلِ لاہور کا حصۂ کثیر اس میں نمازِ عید ادا

کرتا ہے۔البتہ بعض جماعتیں شہر کے باہر میدان میں بھی عید کی نماز ادا کرتی ہیں۔اس روز یہاں بہت رونق ہوتی ہے اور یہ سب اس مسجد کی وسعت کی وجہ سے ہے۔خاصکر مجھے یاد ہے جب اس صدی کے ابتدائی سالوں میں سردار ایوب خان (کابلی) یہاں مع اپنے صاحبزادگان اُن کے دیگر امرا اپنی دواسپہ گاڑی میں نہایت تزک و احتشام سے عید کی نماز کے لیے آتے تو ایک اسلامی شان نظر آتی تھی اور اکثر اُمرا اس میں حصہ لیتے۔مجھے یاد ہے ایک دفعہ علامہ اقبال بھی عید کی نماز کے لیے اپنے دوست نواب ذوالفقار علی خان کے ہمراہ یہاں بروز عید نماز کے لیے آئے مگر دیر ہو چکی تھی اور اندر جگہ نہ تھی، تو انھوں نے اس مقام کے قریب ہی جہاں اب ان کا مزار ہے، نماز عید ادا کی۔اتّفاق سے علی بخش اور ان کا صاحبزادہ جاوید بھی ہمراہ تھے۔ہم ان سے بعد نماز یہیں ملے تھے۔

مساجدِ عالم میں بادشاہی مسجد کا مقام

اپنے ذاتی مشاہدہ اور حالات کے اعتبار سے بھی ہم یہ وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی مسجد بھی کسی اور مسجد کی نقل نہیں ہے یا اُن کی پیمائش برابر ہے کیونکہ ہر عمارت اپنے ماحول اور حالات میں ہی تعمیر ہوئی ہے اگرچہ اصولی طور پر ہر مسجد اسلامی روایاتِ تعمیر کی پابند ہے جو اسلامی عقیدۂ وحدانیت سے وابستہ ہے۔اس اصول کی ابتدا یا ایجاد دراصل مسجد نبوی مدینہ منورہ سے ہوئی جو سب سے اوّل چار دیواروں پر قائم ہوئی اور اسی کا ارتقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے رہائش اور مسجد سے ہی ہُوا، جس میں دیوار قبلہ مع محراب، ایوانِ مسجد صحن، دالان، مینارے اور طاق شامل ہو کر آج مساجد کے لیے اہم حصّے بن گئے ہیں۔یہی تمام آج اس مسجد بادشاہی لاہور میں موجود ہیں اور کسی حصّہ کی پیمائش بھی مشترک نہیں ہے۔دمشق میں جامع اموی اور فلسطین میں مسجد اقصیٰ جو ابتدائی مساجد میں شمار ہوتی ہیں۔اصُولی طور پر بادشاہی مسجد لاہور بھی ان پر قائم ہے۔عراق میں خلیفہ متوکّل (م ۲۳۲ھ) کی مسجد سامرا جو ایک عظیم الشّان مستطیل پر قائم ہے یعنی اس کی پیمائشیں ۸۴۲ فٹ اور ۵۱۲ فٹ اور رقبہ پینتالیس ہزار پانچ سو مربع گز ہے اور دُنیا میں اس سے زیادہ بڑی مسجد آج تک تعمیر نہیں ہُوئی۔افسوس آج یہ کھنڈرات میں ہے اور نہ آباد ہے۔اس کی چار دیواری میں کافی قلعہ نما بُرج بھی موجُود ہے۔اور اس کا مشہور مینار جو اس کی چار دیواری سے شمال میں ۸۹ فٹ فاصلہ پر ہے اسے اس کی پیچ نما شکل کی وجہ سے مَلویّہ پکارتے ہیں۔ہند و پاک میں اوّل عمارت جو آج بھی موجود ہے وہ مسجد قُوّۃ الاسلام دہلی ہے جو ۵۸۷ھ میں تعمیر ہوئی۔اس کا رقبہ سترہ ہزار مربع گز ہے۔اسی کے مینار کو قطب مینار کہتے ہیں جو قریب ایک سو فٹ الگ کھڑا ہے۔اگر سلطان علاء الدین خلجی کا منصوبہ اس مسجد کی توسیع کا پورا ہو جاتا تو تمام دُنیا میں یہ مسجد بڑی شمار ہوتی۔تاہم بادشاہی مسجد لاہور کے اضلاع ۵۷۵ فٹ اور ۵۶۰ فٹ ہیں جن سے اس کا رقبہ ۳۵,۷۷۷ مربع گز ضرور ہے۔اس وجہ سے ہم اسے آج موجودہ عمارات مساجد میں سب سے بڑی مسجد شمار کرتے ہیں۔

بہرحال مساجد کے ضمن میں مصر کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ نہایت اعلیٰ اور ہر زمانہ کی مساجد آج بھی موجود ہیں۔ان میں مسجد عمروؓ بن العاص جو ۲۱ھ میں تعمیر ہوئی۔اس کے بعد مسجد ابن طولون ۲۶۳ھ کی تعمیر ہے۔مگر جامع ازہر ۳۶۱ھ جو آج علاوہ مسجد کے ایک جامع العلوم کے بھی مشہور ہے۔اور یہاں مسجد سلطان حسن سب سے بڑی شمار ہوتی ہے جسے عام طور پر بہت مقبولیت اس وجہ سے ہے کہ ائمۂ اربعہ کے مطالب کو پورا کرتی ہے مگر یہاں کے مقابلے میں ہندوستان کی مساجد جو گجرات، بنگال اور مالوہ میں تعمیر ہوئی ہیں، وہ مصر سے بالکل مختلف ہیں۔مگر دکن میں جامع مسجد گلبرگہ جو ۷۵۳ھ میں تعمیر ہوئی جس کی خصوصیّت یہ ہے کہ تمام عمارت گنبدوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔اسے معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی نے بنایا ہے۔اپنی نوعیت کا یہ ایک واحد نمونہ ہے یعنی اس میں تمام ایوان ہی مسجد ہے اور اس کے ساتھ کھُلا صحن نہیں ہے اور اتفاق سے گلبرگہ کی یہ مسجد

لاہور کی بادشاہی مسجد کے ایوان کے برابر ہے۔

بابر نے ۱۵۲۷ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنا رکھی تھی۔ اس نے اجودھیا اور دیگر مقامات پر بعض مساجد تعمیر کی تھیں اور دہلی کے قلعۂ کہنہ میں جو مسجد شیر شاہ سُوری نے تعمیر کی وُہ بہت شاندار تھی جس میں پتھّر کو کاٹ کر زیب و زینت کی گئی۔ مگر اکبر نے فتحپور سیکری میں جو مسجد تعمیر کی اس کی خصوصیّت اس کا جنوب کی طرف صدر دروازہ ہے جسے اس کی خاص بلندی کی وجہ سے بلند دروازہ کہتے ہیں۔ مگر لوگ اندر سے اس مسجد کو کم دیکھتے ہیں حالانکہ اندر زیادہ خوبیاں ہیں پھر اسی مسجد کے صحن میں مقبرے بھی ہیں۔ شاہجہان فنِ تعمیر کے ضمن میں سب پر سبقت لے گیا۔ اس نے جب آگرہ کے قلعے میں محلّات بنائے تو اس نے سنگ مرمر کی مسجد بھی تعمیر کی جو اپنی نزاکت کی وجہ سے موتی مسجد شمار ہوتی ہے مگر اس نے اس کے فوراً بعد آگرہ شہر میں اپنی لڑکی جہاں آرا کے نام پر ایک جمعہ مسجد سنگ سرخ کی تعمیر کی اور ان مساجد کے گنبدوں کو اس نے بلب نما کر دیا یعنی ایک طرح امتیاز پیدا ہو گیا۔ مگر جب اس نے اپنا دارالخلافہ آگرہ سے دہلی تبدیل کیا تو اسی اعتبار سے شہر کے لیے قلعہ کے قریب ایک مسجد ۱۰۶۰ھ میں تعمیر کی جو اس وقت سب سے بڑی مسجد شمار ہوتی تھی، کیونکہ اس کا ایوان ۲۰۱ فٹ لمبا اور ۱۲۰ فٹ چوڑا ہے۔ جس پر دو مینار ایوان کے سامنے ماتھے پر ہیں حالانکہ اس مسجد کا صحن ۳۲۵ فٹ اور ۲۸۰ فٹ ہے یعنی شاہجہان کے عہد میں مسجد آگرہ اور مسجد دہلی دو ایسی مساجد تعمیر ہوئیں جنھوں نے خاص شہرت حاصل کی مگر لاہور کی مسجد عالمگیر کے معمار نے ان خوبیوں کو مدِّ نظر رکھ کر ایوانِ مسجد پر چاروں طرف نمایاں بُرجیاں بنائی ہیں اور ساتھ ہی مسجد کے چاروں کونوں پر کافی بلند مینار بنا دیے ہیں حالانکہ متذکرہ مسجد قوّۃ الاسلام دہلی (۵۸۷ھ) میں ایک ہی مندنہ (مینار) کافی سمجھا گیا۔ میناروں کو مساجد کے علاوہ مقبروں پر بنایا گیا، جیسا کہ تاج محل آگرہ اور مقبرۂ جہانگیر لاہور پر ہیں اور اس سے بھی ہٹ کر دروازوں پر چار مینار بنائے گئے، جیسا کہ اکبر کے روضہ کے دروازے پر چار مینار ہیں۔ اسی طرح باغ کے دروازہ یعنی چوبُرجی لاہور پر چار مینار بنائے گئے مگر بادشاہی مسجد اس ضمن میں سب پر سبقت لے گئی ہے۔ غرضیکہ اس مسجد کے تمام حصّے کچھ اس طرح بنائے گئے اور ان کو اس طرح ترتیب دے دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ بالکل متمیّز ہی نہیں ہے بلکہ ان پر فوقیّت بھی رکھتی ہے۔ اگر اس کا تجزیہ اس کے دروازے سے شروع کریں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ آج تک کسی مسجد کا ایسا دروازہ ہی نہیں ہے اور فرش پر اس طرح پانی کے نکاس کا اب انتظام نہیں ہے۔ پھر صحن کا اوپر کا حصّہ ایوان تک اس طرح اتنا بلند ہی نہیں ہے بلکہ ایوان پر نہ اس طرح چار بُرجیاں ہی کسی مسجد میں ہیں اور اس طرح دوہرا ایوان بھی نہیں ہے جس میں اگلا حصّہ تو گنبدوں کو سنبھالے ہُوئے ہے اور پچھلا حصّہ محض متوازی چھت دار ہے اور نہ کسی مسجد کے اس طرح سر بسر دالان ہیں مگر اب اس مسجد کے مشرقی دالانوں کو عام وضو کے لیے وقف کر دیا گیا ہے مزید موزونیّت پیدا کرنے کے لیے نہ اس طرح بلند چار مینار کسی مسجد کے کونوں پر لگائے گئے ہیں۔ غرضیکہ یہ مسجد ہر حال میں اپنی آپ ایک بہترین مثال ہے۔ مسجد کے باہر کسی شہر میں آج تک کسی اور مسجد کو ایسا ماحول ہی نصیب نہیں ہُوا جو اسے حضُوری باغ اور اس کے اندر بارہ دری اور قلعہ کی وجہ سے اسے بے مثال فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح ٹھٹھہ میں مسجد شاہجہانی بھی اگرچہ گنبدوں پر کھڑی ہے مگر مختلف ہے۔

نتیجۃً ہم فخر سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیر آج اسلامی فنِ تعمیر میں باعثِ فخر نمونہ ہے اور اس کے علاوہ کسی اور مذہب و ملّت کے ہاں ایسی کوئی عمارت بھی نہیں ہے جس میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اتفاق سے تقریباً ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے اس کی جو مرمت کی گئی ہے اس نے اس کو چار چاند لگا دیے ہیں یعنی مذہبی فنِ تعمیرِ عالم میں یہ مسجد بالکل منفرد نمونہ ہے کیونکہ آج جو عبادت گاہیں دوسرے مذاہب کی تیار ہو رہی ہیں، ان میں جدید تصوّرات نے خاصہ اثر کیا ہے اور اس وجہ سے ان میں مذہبی انفرادیت بالکل مفقود ہو گئی ہے۔

حصّۂ سوم

پنجاب میں سکھوں کا عہد

فرّخ سیَر نے یہاں پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ کو پنجاب کا گورنر ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں مقرر کیا۔ آپ کے بعد آپ کا لڑکا نواب زکریا خاں ۱۱۳۰ھ میں جانشین ہُوا۔ اس خاندان کی یادگار لاہور میں علاقہ بیگم پورہ آج بھی جرنیلی سڑک پر انجنیئرنگ یونیورسٹی کے ملحق موجود ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تاریخ سے کوئی خاص اطلاع نہیں ملتی کہ اس زمانہ میں لاہور میں کون بڑا مسلمان عالم تھا اور وہ مسند قضاۃ پر متمکن تھا یا کس امام یا عالم کا تعلق بادشاہی مسجد سے تھا، مگر اس وقت یہاں پنجاب میں متواتر سکھوں کی بغاوتوں نے خاصی ابتری پھیلا دی تھی۔ اگرچہ بادشاہِ وقت مُحمّد شاہ نہایت زبردست بادشاہ تھا مگر پھر بھی اس ضمن میں کوئی روشنی نہیں پڑتی حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کا زور ہو گیا اور ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۷۷۳ء تک لاہور کی تاریخ میں بہت ہی تاریکی کا زمانہ ہے جب کہ سکھوں کی یورش پنجاب میں ہر طرف نظر آتی ہے اور مسجد شاہی پر ہی نہیں بلکہ لاہور کی تمام مساجد پر ان کا قبضہ تھا اور سکھوں کے عہد میں یہ مساجد بارود گولا کا گودام بنائی گئی تھیں اور یہی مؤرخین نے لکھا ہے ویسے لاہور اس وقت تین حاکموں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ بادشاہی مسجد سے چھاؤنی کا کام لیا جاتا تھا اور گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اس کے فوراً بعد ۱۷۹۹ء سے لے کر ۱۸۳۹ء کا زمانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا عہد ہے اور اس کے مرنے کے بعد لاہور پھر اس کے جانشینوں کے قبضہ میں آگیا۔

سکھوں کی شورش پنجاب کے ضمن میں ہاشم خاں خافی خاں نظام الملک نے منتخب اللباب (۱۱۴۴ھ) میں لکھا ہے کہ آٹھ نو ماہ کے عرصے میں دارالخلافہ شاہجہان آباد دہلی کی دو تین منزلوں کے فاصلے پر دارالسلطنت لاہور کے اطراف میں قصبے اور بستیاں ان وحشیوں کی تاخت و تاراج سے ویران اور بے چراغ ہو گئی تھیں، بکثرت آدمی مارے گئے۔ انھوں نے بے شمار مساجد اور مزاروں کو اکھاڑ کر پھینک دیا اور مسمار کر دیا۔

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب میں مزید بدامنی اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کے خلاف سکھوں کو مدکی کے مقام پر زیر قیادت لارڈ ہارڈنگ شکست ۱۸۴۸ء میں ہوئی جس وجہ سے اسے لارڈ ہارڈنگ لاہور کے لقب سے پکارتے ہیں اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء میں وائسرائے ہند ہو کر آیا۔ اس نے فوراً لارڈ گوج کو سکھوں کی سرکوبی کے لیے ارسال کیا تو سکھوں کو دوسری جنگ میں بھی مکمل شکست ہُوئی جس کے بعد ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء سے برٹش کا مکمل قبضہ پنجاب پر ہو گیا۔

لاہور میں اس وقت سکھوں کی قریب ایک صدی کی شورشوں اور بدانتظامی کی وجہ سے تمام کھنڈرات ہی تھا اور تمام مساجد کو سکھوں کے گولہ اور بارود کا ذخیرہ بنا دیا گیا تھا اور کوئی مسلمان ان میں نماز ادا نہیں کر سکتا تھا۔

سکھوں کا خاتمہ اور برٹش کا قبضہ

یہاں ہم نے مختصر تاریخ سکھوں کے عہد کی پیش کی ہے مگر اس سے واضح ہے کہ اس عہد میں بادشاہی مسجد خصوصیت سے ان کے قبضے میں رہی اور کوئی مسلمان نہ اس میں داخل ہو سکتا تھا اور یہ مسجد بطور چھاؤنی کے استعمال ہوتی رہی۔ مسجد کے صدر دروازہ مشرقی کے سامنے قلعہ کے اکبری دروازے کے باہر مربع میدان کو جلوخانہ کہا جاتا تھا، بقول سوہن لال سوری مصنّف عمدۃ التواریخ عہد رنجیت سنگھ موجودہ بارہ دری حضوری باغ چبوترہ بادشاہی مسجد کہلاتا تھا، یہاں یہ بارہ دری بنائی گئی۔ نہ معلوم وہ چبوترہ کوئی خاص عمارت تھی جسے مسمار کر کے یہ بارہ دری قائم کی گئی۔ جس کا آج بھی ایک حصّہ بصورت ایک حوض بارہ دری سے ملحق باقی ہے اور اس کے ساتھ ایک پُرانا کنواں بھی تھا جسے پُر کر دیا گیا ہے۔ ولیم مورکرافت مشہور سیاح

یہاں رنجیت سنگھ کے عہد میں ۱۸۲۰ء میں آیا تھا اور رنجیت سنگھ نے اسے ملاقات کا موقع بھی دیا تھا اور وُہ فقیر عزیزالدین کے توسط سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حضور میں پیش ہُوا تھا، جو وہ تفصیل بیان کرتا ہے وہ آج کے ماحول سے بالکل مختلف ہے اور یہ موجودہ بارہ دری اس کے بعد یہاں تعمیر ہوئی ہے اور اس کی ملاقات مسجد کے اندر ہوئی تھی جبکہ مسجد کے صحن کو فوج کے قواعد کے میدان میں تبدیل کیا ہُوا تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات پر اس کی راکھ کو بصورت سمادھ مسجد کے شمال مشرقی کونے سے ملحق بنایا گیا ہو آج بھی موجود ہے اور دُور سے وہ ایک اسلامی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی مسجد رنجیت سنگھ کے جانشینوں کے قبضہ میں رہی اور کوئی مسلمان مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دَور میں مسجد کے سازوسامان و پتھر وغیرہ کو خورد بُرد کیا گیا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۴۰ء میں مسجد کے میناروں کی بُرجیاں بھونچال سے گر گئی تھیں اور میناروں پر سے شیر سنگھ نے جو رنجیت سنگھ کا دوسرا لڑکا تھا، جنوری ۱۸۴۱ء میں اپنے برقندازوں کو متعین کر دیا تھا۔ جنھوں نے کھڑک سنگھ جانشین اور لڑکا رنجیت سنگھ کی بیوہ مہارانی چند کور کے حامیوں کو بھگا دیا تھا مگر جب ہیرا سنگھ لڑکا دھیان سنگھ نے شیر سنگھ کے قتل کے بعد سندھیا والا کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی ہلکی توپوں کو مسجد کے میناروں پر رکھ کر استعمال کر کے قلعہ لاہور پر قبضہ کیا تھا۔ تو ہیرا سنگھ باپ کی جگہ وزیر ہُوا۔ مگر جب انگریزوں نے سکھوں کو ہر میدان میں شکست دے دی تو برٹش فوجیں سر ہنری لارنس کی قیادت میں شاہی مسجد میں داخل ہوگئیں تو انھوں نے مسجد اور حضوری باغ کا قبضہ حاصل کر لیا اور ان کی سہولت کے لیے مسجد کے دالانوں میں کچھ کمرے بارکیں اور کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ اس وقت برٹش فوج مسجد کے جنوبی دروازہ پر، قلعہ کے دروازہ پر اور شمال میں روشنائی دروازہ یعنی سمادھ پر متعین کی گئی اور بارہ دری میں برٹش افسروں کا دفتر قائم کیا گیا۔ اس وقت یہ بھی تجویز ہُوا تھا کہ ایک پختہ دیوار قلعہ کے دروازہ اکبری اور استھان کے درمیان کھڑی کر دی جائے تاکہ قلعہ بالکل الگ ہو جائے۔ اس کے بعد سر ہنری لارنس اور دوسرے برٹش آفیسر قلعہ میں داخل ہُوئے اور نہایت احتیاط سے قلعہ کا معائنہ کیا۔ اس کے خندق و نشیمن، بُرج و شیش محل وغیرہ کو شامل کر کے حکم دیا گیا کہ ایک نقشہ قلعہ اور عمارات کا تیار کیا جائے جو آج بھی موجود ہے جو یہاں شائع کیا گیا ہے اور سکھوں کے آثاروں کو صحیح تعین کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اس نقشہ کی موجودگی میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سکھوں کے آثار قلعہ کے دروازے کے سامنے یا اِدھر اُدھر جو نظر آتے ہیں وہ اس وقت نہیں تھے برٹش کا قبضہ تمام پنجاب پر ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو ہُوا جو قلعہ لاہور کے اندر شیش محل کی دیوار پر بھی سنگ مرمر کی سل پر کندہ ہے یعنی بادشاہی مسجد بھی باقاعدہ قلعہ کے ہمراہ برٹش کے قبضہ میں آگئی۔

حِصّۂ چہارم

بادشاہی مسجد حکومتِ برطانیہ کے قبضے میں

برٹش کے ابتدائی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی حالت بالکل کھنڈر سی تھی اور ابھی تک یہ گولہ بارُود کا سٹور ہاؤس۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء میں کیپٹن بلیکر نے مسٹر منٹگمری کمشنر سے مسجد کی مرمت کے لیے درخواست کی جس نے فوراً مسٹر فیگن مہتمم عمارات کو مسجد وغیرہ کی مرمت کا حکم دیا اور مسجد کے اندر سے بعض کمروں وغیرہ سے پتھر کی سلوں کو بھی الگ کرنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد اسی قسم کی درخواست کا اعادہ مسٹر ہنری لارنس سے بھی کیا جو اس وقت چیف کمشنر پنجاب تھے جنھوں نے خود موقع پر آکر مشاہدہ کیا اور مسٹر فیگن جو عمارات کے مہتمم تھے، ان کو دروازہ وغیرہ ٹھیک کرنے کو کہا اور دیگر مرمت کا بھی حکم دیا۔ اس کام کے خرچ کا اندازہ مبلغ دوسَو اٹھارہ روپے (۲۱۸) ہوئے تھے جو اس وقت گورنمنٹ نے منظور کیے۔ اسی اثنا میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے دریافت بھی کیا کہ کیا یہ مسجد اپنے مقاصد نماز کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ جواب یہی ملا کہ ہنوز مسجد گولا بارود کا ذخیرہ ہے۔ حتّٰی کہ یہی صورت جنوری ۱۸۵۶ء تک رہی۔

اس کے بعد گورنمنٹ نے ان تمام گولا بارود کے ذخیروں کو نئی تعمیر کردہ جگہوں میں رکھنے کا انتظام کیا تو میجر جنرل گون سے جو اس وقت لاہور کی کمان کے حاکم اعلیٰ تھے، پوچھا کہ مسجد کو خالی ہونے پر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے تو اس وقت محض یہ خیال پیدا ہوا کہ سر چارلس نیپئر کی بیان کردہ شرائط کو واضح کر دیا جائے، جبکہ مسجد قلعہ لاہور کے اخیر میں واقع ہے، ممکن ہے اس وجہ سے اسے کچھ اعتراض ہو تو جواب ملا کہ فوجی اقتدار کو کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اس امر کو ملکی حکومت سے واضح کر دیا جائے۔ تو میجر جان کلارک کمشنر لاہور ڈویژن کو اس سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ مسجد کو مسلمانوں کے حوالے برائے ادائیگی نماز کر دیا جائے۔ تو ڈپٹی کمشنر لاہور مسٹر بررٹن کو اس سے مطلع کیا کہ معزز اور ذمہ دار مسلمانوں کے حوالے کی جائے۔ اس نے اکیس مسلمانان لاہور کی فہرست ارسال کی کہ اس مفاہمت پر ڈپٹی کمشنر لاہور میجر میک گریگر حکیم سیّد ولی شاہ اور حکیم سیّد بزرگ شاہ مسلمانوں کے نمائندوں کے حوالے مسجد کو کر دے، جو ایک طرح تسلّی کے مساوی ہے۔ اگرچہ یہ وعدہ ان سیّدوں کو محض مسجد کی سرپرستی کا حق پیش کرتا ہے کہ اس طرح مسجد کا قبضہ کر لیں اور یہ بلاشبہ مناسب بھی ہوگا اور شاید یہ بھی ضروری ہو کہ چند معتمد علیہ اشخاص مسجد کا قبضہ بحیثیت ذمہ دار سرپرست عمارت لیں اور ویسے میں کسی کو شخصی طور پر نہیں جانتا کہ کون زیادہ حق رکھتا ہے۔ مگر میں نہایت عمدگی سے سفارش کرونگا کہ چند بڑے مسلمان رؤسا کا طبقہ مسجد کے انتظام کو سنبھال لے جو وقتاً فوقتاً کی تقریبات وغیرہ کا بھی انتظام کرے جیسا کہ ان کو ان کا مذہب اجازت دے۔

۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی

برٹش ریکارڈ کے مطابق میجر کلارک نے ۱۱ جون ۱۸۵۶ء کی صبح ساڑھے پانچ بجے ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ پر مسجد کو حکیم سیّد ولی شاہ اور حکیم سیّد بزرگ شاہ کے حوالے کر دیا، اور ان کو مسجد کا نگہبان مقرر کر دیا گیا اور باقی انیس اشخاص کی ایک کمیٹی مسجد کی دیکھ بھال کے لیے بنا دی اور مندرجہ ذیل شرائط اس سند میں درج تھیں:

"بخدمت شرفاء و رؤسا، حکیم سیّد ولی شاہ اور سیّد بزرگ شاہ کو واضح کیا جاتا ہے کہ مطابق چھٹی نمبر ۱۸۵۴ مؤرخہ ۱۸- اپریل ۱۸۵۶ء از چیف کمشنر لاہور، بادشاہی مسجد جو قلعۂ لاہور کے رقبہ میں واقع ہے، برائے عبادت تمہارے حوالے کی جاتی ہے، تم اس مسجد مذکور کے نگہبان ہو گے۔ تم پر لازم ہے کہ تم کمانڈنگ آفیسر قلعہ متعلق قلعہ و حضوری باغ جس میں یہ مسجد واقع ہے، کے حکم کی پابندی کرو۔ یہ واضح رہے کہ مسجد مذکور ہمیشہ کمانڈنگ آفیسر قلعہ کے ماتحت رہیگی۔ جب کبھی کمانڈنگ آفیسر مذکور ضروری خیال کرے وہ مسجد کے اندر داخل ہونے اور مسجد سے باہر آنے پر پابندی لگا سکتا ہے۔ تم آنجہانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کی بھی اسی طرح عزّت کرو گے جو مسجد کے باہر واقع ہے جس طرح عام طور پر ہندو اور مسلمان اپنی عبادتگاہوں اور بزرگوں کی قبور کی کرتے ہیں۔ اس کے لیے یہ سند تم کو مسجد کی نگہبانی کے لیے دی جاتی ہے۔"

اس کے بعد ماہ جولائی ۱۸۵۶ء میں ستّر برگزیدہ شرفاء مسلمانان لاہور نے بخدمت سرکار انگلشیہ ایک محضر نامہ بطور شکریہ واگزاری مسجد بادشاہی برائے نماز عام مسلمانان عالم پیش کیا۔ یہ محضر نامہ یہاں پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، جس کا ایک عکس میں نے اپنی انگریزی کتاب بادشاہی مسجد میں چھاپ دیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"یہ مسجد کافۃ المسلمین کے لیے ہے اور تولیت و امامت اس کی حسب فرمانِ شاہی و سلاطین مابعد بنام بزرگان سیّد بزرگ شاہ خلف قاضی غلام شاہ مقرر تھی اور بباعث تعصب مذہب قوم سکھاں کی عرصہ چندی باب عبادتِ بے نیاز و ارکان ثواب نماز کا کہ۔۔۔۔ الخ

بہرحال سید بزرگ شاہ کا نام مسجد سے وابستہ تھا اور سکھوں کے زمانے میں نماز کا ثواب حاصل نہیں ہو سکا۔ اور اب یہ مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی۔ اس پر اس زمانہ کے شہر لاہور کے مسلمانوں کے دستخط ہیں مگر ان میں ایک مُہر خوبصورت گول جس میں لکھا ہے" خادم شرع متین قاضی حفیظ الدین ۱۲۷۱ھ" اور ان کے دستخط بھی ہیں یعنی امورِ مذہبی میں قاضی تھے اور اتفاق سے ایک نام "رحیم بخش" بھی پڑھا جاتا ہے جو ممکن ہے راقم کے دادا کے دستخط ہوں اور ان میں مُہریں مع دستخطوں کے زیادہ ہیں۔

اس وقت ۱۸۵۶ء میں مسلمانوں کو یہ مسجد واگزار کر دی گئی تھی مگر اس کے مشرقی حصّہ کے دالانوں کو گرا کر دیا گیا تھا تاکہ قلعہ سے آسانی سے اندرونِ مسجد مسلمانوں کی حد وجہد کا پتہ ملتا رہے۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اوّل مرتبہ لاہور میں (۱۹۰۰ء) لارڈ کرزن آیا، تو اس نے حضوری باغ کی جنوبی دیوار کا وہ حصّہ جو قلعۂ لاہور سے ملحق تھا، اسے گروا دیا تاکہ قلعہ کے فوجی نظام میں کوئی خلل نہ ہو اور "موتی مسجد" جو قلعہ کے اندر ہے اسے بھی واگذار کیا تھا)

مسجد مسلمانوں کو قبضہ ملنے کے بعد

اس کے بعد بھی مسجد ابھی تک برٹش کے انتظام میں ہی شمار ہوتی تھی چنانچہ اپریل ۱۸۵۷ء میں سر جان لارنس نے ایک مراسلہ افواج کے کوارٹر ماسٹر جنرل کو لکھا جس میں کہا گیا کہ افسوس مسجد میں داخل ہونے کے تمام راستے حضوری باغ کے دروازوں کو چھوڑ کر جو محض ایک ہی راستہ ہے، بند کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے مسجد کر دینے کے بعد وہ اس میں داخل ہونے کے حق سے محروم ہو گئے ہیں جبکہ کسی مُلّا یا مؤذّن کی اذان برائے نماز کو سکھ لوگ سُنتے ہیں جن کو اس سے صدمہ پہنچتا ہے اور وہ مسجد کے راستہ کو روکتے ہیں جو ادائیگی نماز بروقت سے محروم کرتا ہے۔ خاص کر رات کے وقت جبکہ حضوری باغ کا سنتری مسجد کے اندر داخل ہونے سے روکتا ہے، مسجد کا عطا کر دینا انگریزوں کا فعل کریمانہ تھا۔

اس طرح مسجد کا مسلمانوں کے حوالے گورنمنٹ کا کر دینا بے معنی ہوگا۔ مَیں حضور کے غور کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اس طرح قلعۂ لاہور کے کمانڈنگ آفیسر کا مسجد تک پہنچنے کی قیود لگانا کوئی ضروری نہیں۔ اس قسم کی پابندی بے شک خطرہ کے دوران لگائی جائے اور اس وقت مسجد کے احاطے میں فائرنگ کرنے کے کافی اختیارات بھی ہیں۔ ان حالات میں سر جان لارنس کو سوا نازک حالات کے کسی قسم کی پابندی نہیں لگانی چاہیے۔ حضوری باغ سے گارد ہٹالی جائے جو ایک طرح تحفّظ میں بھی نہیں ہے اور یہ محض تحفّظ قلعہ کے تحت رہے۔ ممکن ہے سفید مرمر کی بارہ دری حضوری باغ کی حفاظت ہو جائے۔ ان حالات میں کمانڈر انچیف میجر جنرل گون سے درخواست کی جائے، مسجد کے داخلے کی پابندی کو منسوخ کر دے۔

حصّۂ پنجم

مرمّت مسجد

ابتدائی مرمت مسجد

مسٹر ایچی سن، ڈپٹی کمشنر لاہور نے ۱۸۶۵ء میں کمشنر کو مسجد کی مرمت کے لیے مراسلہ ارسال کیا کہ مَیں آپ کی توجہ مسجد بادشاہی کی خستہ حالت کی طرف مبذول کراتا ہوں جبکہ مسجد کو ۱۸۔اپریل ۱۸۵۶ء کو مسلمانوں کے حوالے برائے ادائیگی نماز کر دیا گیا تھا، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس اجازت سے پوری طرح استفادہ نہیں کیا اور اس وقت ان سے مسجد کی مرمت کا بھی کوئی تصفیہ نہیں ہُوا

تھا اور اس مسجد کے ہمراہ نہ کوئی جاگیر یا کوئی معافی برائے دیکھ بھال مسجد کے نہیں ہے اور نہ کوئی رقم تھی جس سے ضروری مرمت ہی کی جائے اور اگر مسلمان اس میں نماز نہ بھی ادا کریں تو یہ توقع کرنا کہ وہ اس کی مرمت کے لیے کچھ ادا کریں اور اس تاریخی یادگار کو برقرار رکھنا آسان نہیں ہوگا۔ ویسے ایکٹ بیس ۱۸۶۳ء سے یہ ضروری ہے کہ مسجد سے تمام پابندیاں ہٹالی جائیں مگر ایکٹ تئیس سے واضح ہے کہ ایک استثناء اس عمارت کے ضمن میں کی جائے، وہ یہ ہے کہ لوگ اس کی تاریخی اور فنِ تعمیر کی حیثیت کے لیے عزّت کریں، جس میں یہ مسجد آتی ہے جبکہ اس کے ہمراہ کوئی معافی یا وقف بھی نہیں ہے اور ان حالات میں کسی کمیٹی وغیرہ کا مقرر کرنا بھی بے سود ہوگا۔ میری رائے ہے مسجد کی مرمت کا کام سنبھال لینا چاہیے اور پبلک ورکس محکمہ کو اس ضمن میں کردار ادا کرنا چاہیے جس کا فرض آثار کا تحفّظ بھی ہے کہ اس کی پوری عمدگی سے مرمت کرے۔ اس کا جواب مسٹر ایچی سن نے ۱۶ جنوری ۱۸۶۶ء کو دیا کہ" اہالیان لاہور مسجد کی مرمت کا وعدہ دے گئے ہیں۔ مسٹر فیرنگٹن کمشنر لاہور نے پنجاب کے سیکرٹری مسٹر تھورنٹن کو لکھا کہ یہ عبادتگاہ اس قدر وسیع ہے اور اسی قدر عرصہ گزر چکا ہے کہ اب اس کی مرمت فوری ضروری ہے۔ یہ تمام عمارت نہایت حسین ہے اور فنِ تعمیرات کا ذوق اس سے وابستہ ہے۔ تو یہ پبلک ورکس کے زیرِ ضابطہ سوم میں آتی ہے مگر جبکہ مسجد مسلمانوں کو دی جکی ہے تو کیا کسی قسم کی مدد اس صورت میں گورنمنٹ پر واجب ہے کہ نہیں ہے جس پر صوبہ کے گورنر میکلیوڈ صاحب نے جواب دیا:" اگر مسلمان فرقہ اس مسجد کے استعمال کا ارادہ رکھتا ہے جس کے تحت اس کی مرمت بھی شامل ہے تو سرکار اس سے دستبردار ہوتی ہے اور متعلق حضرات ہی اس میں ذمّہ دار ہو جاتے ہیں مگر اس کے برعکس اگرچہ اس عمارت کی بیرونی مرمت اس کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ تو آپ کے مراسلے میں بیان کیا گیا ہے کہ شرفائے شہر نے اس کی مرمت کے لیے دو ہزار تین سو تیرہ روپے (۲۰۳۱۳) دیلے ہیں جس سے وہ عمارت کو بچانا چاہتے ہیں، تو اس صورت میں تم محکمہ پبلک ورکس سے رابطہ پیدا کرو جس سے معاملہ طے ہوگا۔ مسٹر ایچی سن نے ضروری معلومات کے بعد جواب دیا کہ مسلمانانِ لاہور گورنمنٹ کے حکم ۱۸۔ اپریل ۱۸۶۶ء سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس میں روزانہ نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کے پاس اس قدر نقد روپیہ نہیں ہے کہ مسجد کو عمدگی سے رکھ سکیں اور مرمت ہو جائے۔ ان کو توقّع ہے کہ سرکار مدار اس میں کچھ استعانت فرمائے تاکہ مسجد محض تباہ ہونے سے محفوظ ہو جائے۔ اس کے بعد یہ معاملہ اس پر ختم کر دیا گیا کہ جب مسلمانوں کو برائے نماز مسجد دی جا چکی ہے تو بے شک اس کا رکھنا ان کے ذمّے ہے۔ مگر ۱۸۶۸ء میں گورنمنٹ کو پھر ایک عرضی غربائے شہر لاہور کی طرف سے دی گئی جس میں مضافاتِ لاہور کے لوگ بھی شامل تھے، کہ غلّہ پر کوئی ٹیکس مسجد کی مرمت کے لیے لگا دیا جائے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد برکت علی خان تحصیلدار لاہور نے مسجد کی بحالی کے لیے کوشش کی جس سے شاملات زمین بندوبست کے پرگنات سے کچھ روپیہ زمینداروں سے حاصل کیا جائے، جس سے اس مسجد کی مرمت وغیرہ ہو سکے۔ اس ابتدائی وقت سے سر رچرڈ ٹیمپل نے ۱۸۶۴ء تک جبکہ مسلمانوں نے ابھی مسجد کو آباد نہیں کیا تھا، مسجد کی مرمت کو سالانہ سرکار نے کیا تو گورنر نے حکم دیا کہ مسلمان اس کے مصارف کے کفیل ہوں۔ آخر کار کئی کمیٹیوں کے بعد ایک رقم جمع کی گئی جس کا زیادہ حصّہ مرمت پر خرچ ہوا تو اس مسجد کو بطور عیدگاہ بھی مقرر کیا گیا۔ اس وقت مسجد میں بعض عُلماء بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مسجد کا خرچ یکصد روپیہ ماہوار تک پہنچ چکا تھا مگر تحصیلدار کا طریقہ روپیہ جمع کرنے کا مفید خیال نہیں کیا گیا جو کہ محض مرضی پر تھا مگر اسے گورنمنٹ نے کسی قسم کے چندہ لینے سے بند کر دیا۔

مسجد کی مرمت ۱۸۷۵ء۔ ۱۹۲۰ء

باوجود اس قدر تحفظات اور کوششوں کے بھی مسجد کو مزید فوری طور پر مرمت کی اشد ضرورت تھی کیونکہ یہ سخت خراب حالت میں تھی۔ چنانچہ انجمن

اسلامیہ اور رُوسائے لاہور جن میں خاص طور پر نواب نوازش علی قزلباش، نواب عبدالمجید خان اور دیگر اہلِ لاہور شامل تھے۔ اس مسئلے کو اٹھایا تو وہ ایک وفد کی صورت میں اس وقت کے ڈپٹی کمشنر سے ملے اور انھوں نے سر ہنری ڈیوز گورنر کو مسجد کا مشاہدہ کرنے کے لیے کہا جس نے خود مسجد میں آ کر مسجد کی موجودہ حالت کا مشاہدہ و اطمینان کیا کہ مسجد کی فوراً مرمّت کی اشد ضرورت ہے اور اس کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے، یعنی گورنمنٹ نے از سرِ نو پھر مسجد کی مرمت کا ذمہ لیا تو گورنمنٹ نے ایک گشتی چٹھی ۹ع مورخہ ۱۳ فروری ۱۸۷۳ء جس میں خاص کر تاریخی دلچسپی کی عمارتوں پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے متعلق منظوری تھی اور بیان کیا کہ اس نے حال ہی میں مسجد کو دیکھا ہے اور انگلینڈ سے اکثر سیاحوں کو ان کے دیکھنے کی ترغیب دی ہے۔ انھوں نے ان کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہؒ دلائی ہے۔ مَیں اور ڈپٹی کمشنر اس کے ذمہ دار ہیں مگر کام کی دفتری زیادتی نے مجھے اسطرف توجہ دینے کا موقع نہیں دیا مگر اس مسجد کے ماتھے کی دیوار کا مسئلہ ہے۔ مجھے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کو اس کی طرف فوری توجہ دینے کو کہنا چاہیے کیونکہ دیوار کو محض قلعہ سے گولیوں کے لیے رکاوٹ سمجھ کر الگ کر دیا گیا ہے اور ابھی تک ملبہ وغیرہ صاف نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے بھی یہ مسجد زیادہ کھنڈر معلوم ہوتی ہے، بہ نسبت اس کے یہ واقعی ہے۔ مَیں اس مسجد اور دیگر گرد و نواح کی عمارتوں کے سوال کو اٹھاؤں گا کمشنر لاہور نے محکمۂ مال سے تین ہزار روپیہ کی رقم نکالی ہے چنانچہ جمعہ مسجد کی بحالی کے لیے رقم کو مہیّا کیا گیا، اور ساتھ ہی میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ نے بھی اس مطلب کے لیے رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے ایک مزید رقم پانچ ہزار روپیہ دی ہے۔ حتیٰ کہ بیس ہزار روپیہ اس طرح ہو گیا جس میں دوسرے بعض مسلمانوں کا بھی شامل ہے۔ جن میں خاصکر راجہ ہربنس سنگھ شیخوپورا جس نے سب سے زیادہ رقم دی ہے۔ ان کے علاوہ پنڈت موتی لال، پنڈت بدری ناتھ، منشی ہرسکھ رائے اور لالہ نہال چند، اس طرح تمام رقم اکتّیس ہزار روپیہ ہو گیا ہے۔ ویسے مسجد کی مرمت کا تخمینہ تیار کرنے کے لیے مسٹر لیزلی کلارک میونسپل انجنیئر لاہور کو کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اندازہ لگایا تھا کہ مسجد کا احیاء اور مرمت ایک لاکھ سولہ ہزار چھ سو سینتیس روپے (Rs. 1,16,637/13/5) حتیٰ کہ تمام مرمت کو عمدگی سے شروع کیا گیا اور کامیابی کے ساتھ کئی سالوں میں ختم ہُوا۔

بعض جگہ سُرخ چونہ استرکاری کو بجائے سُرخ پتھر کے استعمال کیا گیا تا کہ اصل کے ساتھ لگ جائے۔ ۱۸۸۴ء میں رائے بہادر لالہ کنہیّا لال ایگزیکٹو انجنیئر بطور چشم دید گواہ کے اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں: "اگر ہماری ہمدرد سرکار مدار نے ایک دفعہ پھر اس طرف توجہ کی تو یہ کام جلدی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد مسجد انجمن اسلامیہ کے زیر نگرانی رہی۔

مسجد محض اتّفاق سے انجمن اسلامیہ لاہور کی ایک قدیم رپورٹ ۱۸۸۷ء-۱۸۸۸ء کے مطالعہ کا اتفاق ہُوا جو نہایت دلچسپ اور اہم ہے اس سے واضح ہے کہ مسجد میں باقاعدہ مکتب تھا اور مسجد میں باقاعدہ نمازیں، نماز جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں اور معراج النبیؐ اور بارہ وفات کی تقریبات ہوتی تھیں۔ اس میں اتّفاق سے اس زمانہ کے انجمن ہذا کے ارکان کی مکمل فہرست دی ہے اور سر نواب حاجی نوازش علی خان قزلباش اس کے دائمی صدر ہیں۔ لارڈ دفرین نے بھی مسجد کا ۱۸۸۷ء میں معائنہ کیا تھا جبکہ طلباء نے قرآن پڑھ کر سُنایا تھا اور انھوں نے فارسی میں طلبہ سے گفتگو کی تھی۔ یہ سال اتّفاق سے ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کا تھا جس کا جشن کیا گیا تھا۔ مولوی غلام محمّد بگوی امام مسجد اور مؤذّن حافظ ولی اللہ تھے خاصکر یہ واضح ہے کہ مسجد کے گنبدوں کو صاف کرانے کے لیے ۱۰/۲۳۸ روپے خرچ ہُوئے تھے۔ بہاولپور ریاست سے بھی کچھ روپیہ میسر آیا تھا اور منارہ کی بھی آمدنی تھی۔ (آخیر ضمیمہ ملاحظہ ہو)

مسجد کی مرمت کے ضمن میں یہ امر بیان کرنا ضروری ہے کہ ۸ مارچ ۱۹۱۳ء کو ہز ہائی نیس بیگم بھوپال نے بھی مسجد کو دیکھا، اس وقت آپ کی توجہ خاص کو مسجد کے فرش کی طرف مبذول کرایا گیا اور خاص کر یہ بتایا کہ مسجد کے فرش کی بصورت مصلّے مرمت ہو رہی ہے اور اس وقت

یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ ہر ایک مصلّے مرمت ہونے کے بعد یعنی اسے از سرِ نو مرتب کیا جائے تو مبلغ پندرہ ہزار روپیہ کا خرچ آتا ہے۔ چنانچہ آپ نے چھ ہزار روپے کا عطیہ برائے مصلّے یا مصلّے کی تعمیری کیفیت کو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ مگر یکم اپریل ۱۹۱۸ء کو اندازہ لگایا گیا کہ ابھی تک دو سو پچاس مصلّے مرمت ہو چکے تھے۔ حالانکہ ہزاروں کی تعداد میں ان کی پوری تعداد تھی۔

مسجد کی مکمل مرمّت ۱۹۳۹ء —— ۱۹۶۰ء

ہم یہاں ذیل میں اس مکمل طویل رپورٹ مرمت مسجد ہٰذا کا ایک اختصار پیش کرتے ہیں جو گورنمنٹ پاکستان کے محکمہ روڈ و بلڈنگ نے بعد مرمت مرتّب کی ہے، لکھا ہے کہ :

یہ عظیم الشان مرمت ۱۹۳۹ء سے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ انڈیا نے شروع کی تھی اور ۱۹۴۷ء تک وہ محکمہ اس کا سرپرست رہا یعنی تمام کام متعلق مرمت مسجد ہٰذا انجام پاتے رہے، اس کے بعد پاکستان پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ نے اس کام کو سنبھالا اور ۱۹۵۱ء میں یہ کام روڈ و بلڈنگ محکمہ کے حوالے ہو گیا۔ اس محکمہ نے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء تک اس کی سرپرستی کی۔ پھر اس کے بعد سے ۱۹۶۰ء تک پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ پاکستان روڈ و بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے اس کو اپنی تحویل میں لیا، حتّٰی کہ یہ عظیم الشان کام بخیر و بخوبی انجام پا گیا اور محکمۂ آثارِ قدیمہ ۱۹۳۹ء سے اخیر تک اس کام جس کا آغاز ۱۹۳۹ء سے سر سکندر حیاتؔ کی تجویز سے ہُوا تھا، میں تعاون کرتا رہا اور میاں امیر الدین بحیثیت نمائندہ انجمن اسلامیہ لاہور وابستہ رہے۔

اس عرصہ اکیس سال میں تمام مسجد کو از سرِ نو مرمت کیا گیا اور جہاں ضروری تھا، اس کی تجدید بھی کی گئی۔ اس کے بڑے بڑے پہلو یہ ہیں :

(۱) مسجد کا صدر دروازہ اور سیڑھیاں جو مشرق کی جانب ہیں۔

(۲) مسجد کے والان جو مشرق کی طرف ہیں، ان کو از سرِ نو بنایا گیا۔

(۳) دالانوں میں مستورات کے لیے وضو کے لیے انتظام کیا گیا جو پہلے بالکل نہیں تھا۔

(۴) مسجد کا ایوان جس پر تین گنبد ہیں، ان کی پوری طرح تجدید کی گئی۔

(۵) مسجد کے چاروں میناروں کو مع ان کی بُرجیوں کے از سرِ نو بنایا گیا۔

(۶) مسجد کا فرش سُرخ پتھر سے بالکل از سرِ نو باندھا گیا۔

(۷) مسجد کے شمال و جنوب کے دالانوں کو از سرِ نو پلستر کیا گیا۔

(۸) شمال و مشرق کے کونے میں ٹٹیاں بنائی گئیں۔

(۹) صحن کے مرکز میں حوض کو سنگ مرمر کا بنایا گیا۔

(۱۰) مسجد کے باہر تمام میدان اور گرد و نواح کو ٹھیک کیا گیا۔

(۱۱) مسجد کے ٹیوب ویل (پانی کے انتظام) کو اوپر اوپر اور نیچے نیچے ٹھیک کیا گیا۔

(۱۲) مسجد کے اندر بجلی کا تمام انتظام از سرِ نو ٹھیک کیا گیا۔

(۱۳) مسجد کے چاروں میناروں کے لیے روشنی کا انتظام کیا گیا۔

(۱۴) مسجد کے ملازمین کے لیے رہائشی مکانات کا انتظام کیا گیا۔

(۱۵) مسجد کا موجودہ منبر سنگ مرمر کا از سرِ نو بنایا گیا۔

کُل خرچ

اس تمام مندرجہ تفصیل مُرمّت میں بعض حصّوں کی تجدید اور بعض حصّوں کو از سرِ نو بھی بنایا گیا یعنی یہ تمام کام قریب اکیس سال کے عرصہ یعنی ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر اکتوبر ۱۹۶۰ء تک میں اعلےٰ کاریگروں، ماہرین اور انجینئروں کے ہاتھوں بخیر و خوبی اُنچاس لاکھ روپیہ کی لاگت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس تمام مندرجہ بالا تعمیر اور مرمت کا اندازہ جو خرچ ہُوا وہ اُنچاس [۴۹] لاکھ روپیہ ہے جس کی مختصر تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے :
صدر دروازہ مشرقی کے ہر دو جانب دالان از سرِ نو دیگر اندرونی دالانوں کی شمال و جنوب میں بنائے گئے جن کو برٹش نے ۱۸۴۶ء میں سکھوں کے ساتھ زمانۂ جنگ میں گرا دیا تھا۔ یہاں نئے وضو خانے بنا دیے گئے ہیں اور ان کے نیچے حُجرے بنا دیے گئے ہیں جو پہلے ہرگز نہیں تھے۔ اسی طرح جنوب میں مغرب کی جانب دالانوں کے بعض حصّوں کو بند کرکے وہاں عورتوں کے لیے وضو و استنجا کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہاں خصوصیت سے پانی کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے اور اس حصّۂ جنوب کو عورتوں کے استعمال کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ مغرب کی طرف کے دالان بھی شامل ہیں۔ صدر دروازہ کے ماتھے کو از سرِ نو بنایا گیا ہے۔ خاصکر یہاں بعض قدیم گم شدہ برجیاں وغیرہ کو از سرِ نو بعض موجودہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ خاص کر صدر دروازہ کے طاق پُرانے مغل نمونے کے مطابق ساگوان لکڑی کے از سرِ نو بنائے گئے ہیں جن پر اُبھرے ہُوئے پیتل کے آویزے لگائے گئے ہیں۔ مغربی حصّہ فرش جو اس سے قبل چھوٹی اینٹوں کا بصورت مصلّے جات تھا اسے از سرِ نو سُرخ پتھر کی سلوں سے لگایا گیا ہے جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے، وہاں لوہے کے سوکیٹ فرش پر لگائے گئے ہیں تاکہ شامیانے وغیرہ لگانے میں سہولت ہو۔ ٹلکیوں کو مناسب مقام پر فرش کو صاف اور دھونے کے لیے لگایا گیا ہے۔ حوض کو عمدگی سے صاف کرکے اس کے گرد سفید سنگِ مرمر کا جنگلا لگا دیا گیا ہے۔ ایوانِ مسجد کو جہاں امام خطبہ دیتا ہے اور امامت کرتا ہے، پوری طرح اندر اور باہر سے از سرِ نو ٹھیک کیا گیا ہے۔ یہ تمام کام ۱۹۳۹ء سے شروع ہُوا تھا، آخر ۱۹۵۸ء میں ختم ہُوا، اس دوران میں گنبدوں کی بیرونی سنگِ مرمر کی سلوں کو از سرِ نو اکھیڑ کر پھر لگایا گیا ہے۔ ایوان کے اندر کا تمام فرش جو پہلے چھوٹی اینٹوں کا تھا اسے تمام کا تمام سنگِ مرمر کے مصلّوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ان کے حاشیے سنگِ موسیٰ سیاہ کے ہیں۔ سنگ ابری کو تمام ازارہ ایوان پر از سرِ نو لگایا گیا ہے۔ ایوان کی بُرجیاں جو کونوں پر ہیں، ان کو از سرِ نو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح کونوں کے چاروں میناروں کو جن کی اونچائی ۱۷۶ فٹ ہے کو محض از سرِ نو ٹھیک ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان پر بُرجیاں جو ۱۸۴۰ء میں بوجہ بھونچال ضائع ہو گئی تھیں، ان کو از سرِ نو بالکل نیا بنایا گیا ہے اور سکھوں نے بھی ان کو ۱۸۴۶ء میں خراب کیا تھا، اسی طرح ان میناروں کے مغل ڈیزائن کے دروازے لگائے گئے ہیں۔

اس تمام مرمت مسجد کی وجہ سے یہ بھی لازمی تھا کہ اس کے گرد و نواح و احاطہ جن کی طرف عرصہ سے توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ان کو بھی اسی معیار سے ٹھیک کیا جاتا۔ چنانچہ مسجد کا بیرونی مغربی حصّہ جنوبی حصّہ اور صدر دروازہ کے باہر باغات وغیرہ از سرِ نو ٹھیک کیے گئے ہیں، جس میں علامہ اقبال کا مقبرہ اور سکندر حیات خان کی قبر بھی شامل ہیں۔ پُرانا کنواں جو مسجد کے جنوب مشرقی کونہ کے قریب باہر ہے اور اسے ۱۹۳۲ء میں ٹیوب ویل میں تبدیل کر دیا گیا تھا، اسے از سرِ نو ٹھیک کیا گیا ہے۔ مسجد کے جنوب کی طرف ایک اور مزید مثلثی میدان بھی قائم کیا گیا ہے اور ساتھ ہی گرد و نواح کی دیوار جس کی لمبائی ۳۶۰ فٹ اور اس کی اونچائی سات فٹ سات انچ ہے۔ ان ٹیوب ویل کو احاطہ کرتی ہوئی بنائی گئی ہے۔ سنگِ مرمر سفید کا منبر محراب کے قریب از سرِ نو بنایا گیا ہے جس کے نیچے بجلی کا سوچ قائم کیا گیا ہے جہاں لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا تعلق ہے۔ خطیب، دوسرے عملہ کے لیے رہائشی مکانات مسجد کے قریب بنائے گئے ہیں۔ اور مسجد کے باہر جنوبی حصّہ بھی مرتب کیا گیا۔

مسجد کی زیادہ تر تعمیر، مرمت اور اس کے احیا کے کام پر نواب زین جنگ، ماہر تعمیر کار نظام حیدر آباد دکن ابتدا ۱۹۴۷ء متعیّن تھے اس کے بعد حبیب سوم جی نے اس کام کو اپنے ذمّے لیا۔ اس کے بعد خان بہادر محمد سلیمان نے سنبھالا اور خان بہادر انعام اللہ خان نے بھی اس میں حصّہ لیا اور انجمن اسلامیہ لاہور کے صدر اور اہلِ لاہور کے نمائندہ کی حیثیت سے میاں امیر الدین ابتدا سے لے کر آخیر تک اس کام مرمت سے وابستہ رہے اور محکمۂ آثارِ قدیمہ گورنمنٹ کا تعاون ہمیشہ شاملِ حال رہا۔ مصالح عمارت کے ضمن میں ابتدا سے ہی سُرخ پتھر آگرہ کے گرد و نواح سے اور سنگِ مرمر

مکرانہ جودھپور سے مہیا کیے گئے۔

غرضیکہ بے شمار کاریگیروں، مستریوں اور مزدوروں نے صبح و شام اس کام میں حصّہ لیا اور ان کے علاوہ ہمیں یہ بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ کس قدر کثیر مقدار میں مصالح بصورت پتھر، اینٹیں، چونہ وغیرہ استعمال ہوا ہوگا، جن کے انچاس لاکھ روپیہ کی رقم کثیر اس پر خرچ ہوئی۔

حصّہ ششم

انجمن اسلامیہ لاہور

ان حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے محمد برکت علی خان جو در اصل شاہجہانپور ہندوستان کے باشندے تھے اور پنجاب میں انگریزوں کے عہد میں مختلف عہدوں پر رہ چکے تھے مگر اس وقت وہ اتفاق سے تحصیلدار لاہور تھے۔ جب مسلمانوں نے محسوس کیا تھا کہ مسجد بادشاہی لاہور جو اتفاق سے سب مسلمانوں کے لیے بنائی گئی ہے اور اس کی اس وقت سکھوں کے بطور چھاؤنی استعمال کرنے کی وجہ سے مرمت طلب تھی، تو مسلمانوں نے ان سے مل کر یہاں لاہور میں اس مسجد کی دیکھ بھال کے لیے ایک متحدہ کوشش کے طور پر انجمن اسلامیہ کی تشکیل کی جس کا وجود ۱۸۶۹ء سے ہوا۔ جس میں لاہور کے اکثر شرفاء شامل ہوئے اور محمد برکت علی خان اس کے متفقہ طور پر سیکرٹری قرار پائے۔ اس نے اس انجمن کے نام پر چندہ جمع کرنا شروع کیا تاکہ مسجد کا خاطر خواہ انتظام اور مرمت وغیرہ بھی ہو سکے۔ ساتھ ہی اس مسجد کے اس وقت مسجد سنہری اور ٹکسالی دروازہ مسجد بھی ان کے قبضہ میں دی گئی تھیں۔ سب سے اوّل برکت علی خان نے مسجد کے جنوب کی طرف سے تمام ملبہ ہٹا دیا اور پانی کے انتظام کو ٹھیک کیا۔ انھوں نے باقاعدہ اس وقت مسجد کی امامت کے لیے مولانا غلام محمد بگوی متوفیٰ ۱۳۱۸ھ کو امامتِ مسجد کے لیے اور حافظ ولی اللہ کو مؤذن کی حیثیت سے مقرر کیا اور ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی مسجد میں قائم کیا، مگر حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی غلام محمد سے قبل ان کے چچا مولانا احمد دین بھی اس مسجد سے وابستہ تھے۔ ہم یہاں ذیل میں الگ "خطباء مسجد" کے تحت ان کو بیان کریں گے۔ بہر حال اس وقت یعنی ۱۸۶۶ء سے مسجد کا انتظام انجمن اسلامیہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ اہلِ لاہور کو ترغیب دی گئی کہ مسجد میں دلچسپی لیں اور عیدین کی نمازیں یہاں ادا کریں اور عام مسلمانوں سے درخواست کی گئی کہ شہر میں ہر نکاح پر چار آنے بطور چندہ مسجد ادا کیا کریں، تو اس طرح تھوڑے عرصہ میں خاصی رقم میسر آ گئی اور مسجد کی مذہبی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں جب عید کی نماز ہوئی تو قریب چھ ہزار مسلمانوں نے یہاں نماز ادا کی اور ۱۸۷۶ء میں مسجد کے صدر شرقی دروازے کے طاق از سرِ نو لکڑی کے نئے بنوائے گئے اور مسجد ہذا شہزادہ ویلز انگلینڈ جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم بادشاہ ہوا، کے پروگرام تشریف لاہور میں شامل تھی۔ (ضمیمہ ملاحظہ ہو اس انجمن کا ذکر ہم نے پہلے بھی کیا ہے۔)

برٹش سرکار کا زمانہ

اگرچہ سرکار برٹش کا ابتدا سے آثار قدیمہ کی طرف توجہ کا ایک اعلیٰ کام ضرور نظر آتا ہے مگر قدیم آثار کے تحفظ کا انتظام باقاعدہ لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی کوشش سے ۱۹۰۴ء سے ہوا جس نے خود اس میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ اس محکمہ کے تحت سرکار ہند کو وسیع اختیارات بھی قدیم آثار کے تحفظ کے حاصل ہو گئے تھے مگر اس محکمہ کے تحت خاص کر ان مذہبی عمارات کا تحفظ جو ان کے ہم مذہب لوگوں کے قبضہ میں تھیں، اختیار اس قدر نہ تھا، البتہ اس کے تحت صلاح و مشورہ ضرور دیا جا سکتا تھا۔ اتفاق سے اس مسجد کے صدر دروازہ کے سامنے حضوری باغ میں ایک قدیم یادگار بارہ دری بھی ہے جسے ۱۹۱۲ء میں از سرِ نو ترتیب دیا گیا تھا اور اس وقت لارڈ ہارڈنگ وائسرائے

ہند نے یہاں آکر اس باغ میں کھدائی کرائی تو اس نے اس باغ کی گم شدہ اصل سطح کو نیچے سے نکالا تو اس کے بعد یہ باغ از سرِ نو ترتیب دیا گیا جیسا کہ آج نظر آتا ہے مگر اس باغ میں آج بھی ایک حوض الگ بے ترتیب نظر آتا ہے جسے میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسی قدیم عمارت کا حصّہ ہے جو رنجیت سنگھ کے حضوری باغ کی تعمیر سے قبل کسی قدیم عمارت کا حصّہ تھا، اس کی خیابانوں کو از سرِ نو مرتب کیا گیا، ویسے لاہور کے اس حصّے کا ذکر لارڈ کرزن کی اس تقریر میں بھی ہے جو اس نے ۱۹۰۰ء میں کی تھی۔ اس نے کہا کہ جب میں سال گزشتہ اپریل ۱۸۹۹ء میں لاہور میں تھا میں نے قلعہ کی عمارات یعنی موتی مسجد قلعہ لاہور کو دیکھا تھا جسے رنجیت سنگھ بطورِ خزانہ استعمال کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں لارڈ کرزن نے حضوری باغ کے جنوب مشرقی کونہ کی دیوار کو جو قلعہ سے ملحق تھی گرا دیا تھا۔ موتی مسجد سے اس کو صاف کرا دیا تھا۔

اسی زمانہ میں لارڈ کرزن نے بادشاہی مسجد کے لیے ایک بہت بڑی لالٹین اور دو اور فانوس شکل کے شمعدان عنایت کیے، بڑی لالٹین تو مسجد کے صحن میں ہمیشہ موجود رہی جسے کچھ عرصہ ہوا پاکستان ظہور میں آنے کے بعد اٹھا دیا گیا اور شمعدان مسجد کے دروازہ میں اور مسجد کے ایوان کے مرکز میں گنبد کے زیر موجود رہے۔ ان کی بناوٹ ایک خاص درجۂ فن کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح لاہور میں مسجد وزیر خان کے لیے لارڈ کرزن نے منبر بھی عطا کیا جو آج بھی موجود ہے کیونکہ ان ہر دو مساجد، وزیر خان اور بادشاہی مسجد میں پختہ منبر نہیں تھے اور نہ بنائے گئے تھے۔

مسجد محفوظ آثار قدیمہ بعہد برٹش

لاہور ہمیشہ سے پنجاب کی سیاست کا مرکز رہا ہے۔ ایک مرتبہ ۱۹۱۳ء میں جب سیاسی ہنگامے ہو رہے تھے اور ادھر جنگ بلقان و طرابلس کے بادل بھی اسلامی ممالک میں چھائے ہوئے تھے تو شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا اور کوئی جلسہ عام کسی پبلک ہال میں نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ مسلمانوں نے ایک جلسہ طرابلس کے شہیدوں کے حق میں اس مسجد میں کیا۔ اور اتفاق سے راقم نے بھی اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ اس جلسہ میں خصوصیت سے علّامہ اقبال نے ایک نظم لَے سے بعنوان "حضورِ رسالت مآبؐ میں" پڑھی تھی۔ مَیں نے دیکھا تھا کہ مسجد کے ایوان کے ماتھے میں لوگ جمع تھے اور سب آبدیدہ تھے بلکہ علّامہ خود بھی اس حالت میں تھے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۱۹ء میں جب ہر جگہ رولٹ ایکٹ کے خلاف ہنگامے ہو رہے تھے تو شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا مگر لوگوں نے شاہی مسجد میں جلسے شروع کر دیے جسے گورنمنٹ نے متذکرہ بالا شرائط کے تحت بند کر دیا تھا اور لاہور کے انچارج اس وقت کرنل جانسن تھے، مگر مسجد کو اس کے بعد مرمت کی سخت ضرورت محسوس ہوئی اور انجمن اسلامیہ لاہور کے سیکرٹری اس وقت خان بہادر محمد برکت علی خاں کے پوتے خان سعادت علی تھے اور گورنمنٹ سے بھی چندہ برائے مرمت کی درخواست کی گئی تھی۔ اس وقت گورنمنٹ نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اس مسجد کو اندریں حالات محکمہ آثارِ قدیمہ کے ضمن میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ عمل ۱۹۲۴ء میں ہُوا اور اسی وقت مسجد وزیر خاں بھی اس کے ہمراہ شامل کر لی گئی اور اس وقت ایک ماہر آثارِ قدیمہ انجینیئر کو گورنمنٹ نے متعین کیا کہ اس کی پوری مرمت کے لیے نقشے اور اندازہ تیار کرے۔ چنانچہ اس کے بعد اس پر جو عمل ہُوا وہ ۱۹۳۹ء سے ہُوا جسے ہم یہاں پہلے الگ بیان کر چکے ہیں۔

ہم اوپر رولٹ ایکٹ کا ذکر کر چکے ہیں جس کے ضمن میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ لاہور میں سوا مساجد کے کوئی جگہ محفوظ نظر نہیں آتی تھی، جبکہ پبلک میں کوئی شخص نہ تقریر کر سکتا تھا اور نہ کوئی پبلک جلسہ ہی ہوتا تھا اور ہر جگہ فسادات کا خطرہ تھا۔ چنانچہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تھا انھیں ایام ۱۹۱۹ء میں لاہور میں مولوی عبدالحی فاروقی صاحب درسِ قرآن دیتے تھے تو انھوں نے اپنا درس لوگوں کی درخواست پر ان ایام میں شاہی مسجد میں شروع کر دیا تھا چنانچہ ایک روز مولوی عبدالحی فاروقی درس دے رہے تھے اور ایک پولیس آفیسر مسلمان بھی بیٹھا اپنی ڈائری

لکھ رہا تھا، جسے نوجوان مسلمانوں نے دیکھا تو غضبناک ہو کر اس پر حملہ بول دیا، جس کی بنا پر بعض احباب پکڑے گئے۔ ان میں خاص کر ہمارے مرحوم دوست بشیر احمد مالک بمبئی بوٹ ہاؤس ڈبی بازار لاہور قابلِ ذکر ہیں جن کو سزا بھی ہو گئی تھی۔ اور خود مولوی عبدالحی بھی گرفتار ہو گئے۔

اس کے بعد عدمِ تعاون کی تحریک ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئی تو مولوی عبدالحی صاحب جامعہ ملیہ دہلی پروفیسر تاریخ ہو کر چلے گئے پھر جب پاکستان ظہور میں آیا تو آپ لاہور اسلامیہ کالج میں بطور پروفیسر اسلامیات شامل ہوئے تھے۔

غرضیکہ مسجد مذکور ان حالات میں امامت یا خطابت کے فرائض کے لیے کوئی شخص نہ تھا اور مسجد گورنمنٹ کے قبضے میں چلی گئی تھی حتیٰ کہ ۱۹۲۴ء میں پھر مسجد مسلمانوں کو مل گئی۔ اور اس کو بطور محفوظ آثارِ قدیمہ بھی ۱۹۲۴ء سے شمار کیا گیا

سیاسی ماحول بعہد برٹش

اس ملک کا مورخ ضرور لکھے گا کہ جب ۱۹۲۱ء میں تحریک عدمِ تعاون نہایت زوروں پر تھی اور لاہور میں ہندو مسلمان مل کر اس میں عملی حصہ لے رہے تھے۔ لوگوں نے بدیشی کپڑا کو خیرباد کہنے کے لیے کئی ہزار کی تعداد میں بدیسی کپڑے کے بنے ہوئے ملبوسات جمع کیے تھے اور ان کو راوی کے کنارے ایک عظیم الشان ڈھیر کی صورت میں جمع کر کے مشہور سیاسی کارکن لالہ لاجپت رائے نے اس ڈھیر کو آگ لگائی تھی۔ اس مجمع میں اہلِ لاہور کی کثیر تعداد جمع تھی۔ لالہ جی نے آگ لگانے سے پیشتر عوام کی تسلی کے لیے فارسی کا مشہور مقولہ کہا تھا، یعنی "آنچہ بر خود نمی پسندی بر دیگراں مپسند" کے تحت بھی یہ ملبوسات جلا دینے چاہئیں اور کسی کو نہیں دینے چاہئیں۔ اس تحریک میں مسلمانوں میں سے جو لوگ سرگرم تھے، ان میں لاہور کے سرگرم سیاسی رضاکار تھے۔ مجھے یاد ہے ایک روز مولوی غلام مرشد ان رضاکاروں میں چلے گئے تو آپ اپنا سفید بدیسی ململ کا عمامہ نذر کر آئے تھے اور اس کے بدلے کسی نے آپ کو ایک لُنگی پیش کر دی تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ محض خشک مُلّا ہی نہیں تھے بلکہ خوشگوار عام پبلک کے کام آنے والے مسلمان بھی اپنے زمانہ میں تھے۔ اسی طرح آپ نے مسجد شہید گنج لاہور کی تحریک میں بھی حصہ لیا تھا اور کلکتہ میں جب جمعیۃ العلماء کا جلسہ ۱۹۴۵ء میں ہوا تو آپ نے اس میں عملی طور پر حصّہ لیا، جس میں خصوصیت سے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا راغب احسن وغیرہ نے بھی حصّہ لیا تھا، اس وقت مولوی غلام مرشد نے ایک مطبوعہ خطبہ بھی پیش کیا تھا جس میں خصوصیت سے کانگرس کے موقف کی سخت مخالفت اور تحریکِ پاکستان کی بھرپور حمایت کی تھی۔

۱۹۳۶ء میں تحریک مسجد شہید گنج بڑے زوروں پر تھی۔ ملک کا ہر فرد پریشاں تھا اور کئی اشخاص بے گناہ شہید ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں کئی جلسے بادشاہی مسجد میں بصورتِ خطبہ جمعہ وغیرہ بھی ہوئے۔ ایک جمعہ کے روز بعد نماز مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی لوگوں سے خطاب کر رہے تھے۔ اور مجمع کثیر تھا۔ ہم نے دیکھا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی مسجد میں پروفیسر عنایت اللہ ملک کے ہمراہ تشریف لے آئے اور مجمع کے ایک طرف ہو کر تقریر سُننے لگے۔ چونکہ لوگ ہمہ تن متاثر تھے۔ آپ تھوڑی دیر بعد اسی طرح بغیر کسی تقریر یا تقریب کے واپس چلے گئے۔ میرا خیال ہے قائدِ اعظم اس کے بعد مسجد میں تشریف نہیں لائے۔ میں خود اس روز وہاں موجود تھا۔

حصّہ ہفتم

لاہور میں اسلامی ماحول

عُلمائے دین

مندکرہ بالا مساجد لاہور کی موجودگی میں خاصکر اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد حکومت میں جس وقت یہاں اس کی اپنی مسجد بادشاہی ۱۰۸۴ھ میں تعمیر ہوئی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے جس کا ذکر ہماری تاریخ میں باقاعدہ نہیں ملتا اور یہی صورت اس کے خطیب یا امام یا موذن کے متعلق ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے "فتاویٰ" کی تدوین ضرور ہوئی، جس کا ذکر محمد کاظم نے بھی عالمگیر نامہ (صفحہ ۵۳) میں کیا ہے کہ اس عہد میں فتاویٰ عالمگیری ۱۰۷۵ھ اور ۱۰۸۲ھ کے مابین سالوں میں تدوین ہوا۔ جن عُلماء نے اس کی تدوین میں حصّہ لیا، ان میں اتّفاق سے لاہور کے عُلماء بھی شامل تھے، جن میں خاصکر مُلّا محمد اکرم بن مُلّا محمد یحییٰ کا ذکر ملتا ہے، وہ ابتداء میں شہزادگان کی اتالیقی پر مامور تھے، اورنگ زیب کی عنایت کا ان کو افتخار حاصل تھا۔ وُہ فتاویٰ عالمگیری کے ایک رُبع کی ترتیب پر مامور تھے۔ مراۃ العالم مولفہ بختاور خان کے مطابق ان کا انتقال ۱۰۹۴ھ میں ہُوا۔ بقول علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی لاہور میں کوئی شخص پسر مُلّا یحییٰ کی فضیلت کو نہیں پہنچتا تھا۔ راقم نے اکثر کتب خانوں میں "فتاویٰ عالمگیریؒ" کے نسخوں کو دیکھا ہے مگر اتفاق سے مجھے بھیرہ (ضلع سرگودھا) کی جامع سُوری کے کتابخانہ میں فتاویٰ کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۵۳ء میں دیکھنے کا اتفاق ہُوا جس کے تعلیقہ میں لکھا تھا:

"قد وقع شیخ غلام حسن فی سبیل اللہ الدفتر الثانیہ فتاوی عالمگیری ۷ شہر شوال ۱۱۰۷ھ"

یعنی یہاں پنجاب میں کیا بلکہ میرے خیال میں فتاویٰ عالمگیری سے لوگ خوب آشنا تھے اور یہاں یہ متداول دینی کتاب تھی اور یہ نسخہ خاصہ قدیم ہے جبکہ اورنگ زیب کا خود اسی کے قریب دس سال بعد انتقال ہوتا ہے۔ ویسے اس کتابخانۂ مسجد بھیرہ میں بعض دیگر کتب کے قدیم نسخے بھی دیکھے جو بہت اہم تھے۔ اس مسجد کی بنا ۹۴۷ھ میں ہوئی تھی اور یہ شیر شاہ سُوری کے زمانہ کی یادگار رہے ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب عہدِ برطانیہ میں مسجد بادشاہی لاہور کو مسلمانوں کے حوالے ۱۸۵۶ء میں کیا گیا، یا تو اتفاق سے یا کسی سند کی بنا پر جس کا ہمیں محض قیاس ہے، قریہ "بگہ" کے علماء ہی کو اس کی امامت یا خطابت عنایت کی گئی جسے ہم ذیل میں بر موقع بیان کریں گے "اُور بگہ" یہاں سے دُور بھی نہیں ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بھیرہ ابتداء سے ہی اپنی جغرافیائی جائے وقوع کی بنا پر وسطِ ایشیا اور ہند کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے، کیونکہ سلطان محمود غزنوی، امیر تیمور اور بابر یہیں سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہُوئے۔

ہمیں بعض مأخذ سے ملتا ہے کہ اس زمانہ میں چند صوفیائے کرام لاہور میں تھے جو خاصکر طبقۂ علماء میں شمار ہوتے تھے، اُن میں مُلّا خواجہ بہاری خاص طور پر بیان کیے جاتے ہیں جن کا ذکر مُلّا سعداللہ وزیر اعظم شاہجہان کے بیان میں ملتا ہے۔ مگر مُلّا عبدالسلام لاہوری کے شیخ الاسلام کے معاصرین میں ہیں۔ یہاں مُلّا جمال لاہوری کا ذکر ملتا ہے جن سے مُلّا عبداللطیف سلطانپوری نے علوم حاصل کیے اور مُلّا سیّد علی اکبر کو "سعداللہ خانی" بھی لکھا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمیں کسی عالمِ دین کا براہِ راست اس مسجد سے تعلق نہیں ملتا۔

مساجد سے متعلق علماء

ہمیں بادشاہی مسجد لاہور کے ضمن میں کسی خاص امام یا عالم کا ذکر نہیں ملتا، مگر لاہور کی دیگر مساجد کے بیان میں بھی مشکل سے چند اسماء ملتے ہیں جس سے لاہور کی دینی حالت کا پتہ چلے۔ تاہم حسنِ اتفاق سے لاہور میں بعض مساجد کا ثبوت تو مساجد کے اپنے کتبات سے بھی ملتا ہے، جن میں اس عہد یا کسی شخصیت کا تعلق ظاہر ہو۔ اگرچہ مساجد پر کتبات تو عہدِ اکبر سے ملتے ہیں مگر شخصی طور پر ہمیں ایک مسجد میراں صدرِ جہاں کا ذکر ایک مسجد کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے جو یہاں ۱۰۱۵ھ میں جہانگیر کے دوئم سال جلوس میں تعمیر ہوئی تھی اور وہ یہاں مفتی یا قاضی القضات کے عہدہ پر فائز تھے اگرچہ یہ اصل مسجد تو آج موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کتبہ آج مسجد خراسیاں لوہاری منڈی چوک میں محفوظ ہے۔ لاہور کے بعض مورخین نے جہانگیر کے عہد کی عیدگاہ کا بھی ذکر کیا ہے جو موجود نہیں ہے مگر اتفاق سے یہاں مستی دروازہ کے اندر اور قلعۂ لاہور کے مشرقی دروازہ کے باہر ایک پرانی مسجد "بیگم شاہی" کے نام سے موجود ہے۔ جو یہاں ۱۰۲۳ھ میں تعمیر ہوئی جو اس کے کتبات سے واضح ہے مگر پھر بھی کسی عالم کا ذکر نہیں ملتا مگر ۱۰۴۴ھ میں یہاں لاہور میں نواب وزیر خان والئ لاہور تھا۔ یہ مسجد بہت شاندار ہے اور اس نے اس مسجد کو شہر کے وسط میں تعمیر کیا جو حسنِ اتفاق سے آج بھی موجود ہے اور تمام دُنیا کے سیاح اس مسجد کی زیارت کے لیے آتے ہیں جس پر کافی کتبات بھی کاشی کاری میں مرقوم ہیں اور نہایت اعلیٰ اسلامی خطاطی کی طرزوں میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کو لکھا ہے۔ ان کے مطالعہ سے تین کاتبوں کے نام ملتے ہیں یعنی محمد علی جس کا نام مسجد کے مشرقی صدر دروازہ پر خطِ نستعلیق میں کتبات کے اخیر ملتا ہے۔ یہ شخص اپنے زمانے میں اعلیٰ کاتب ہی نہیں تھا مگر وہ تصوّف میں اعلیٰ مقام رکھتا تھا اور وہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے مُریدوں میں سے تھا جس کا ذکر شہزادہ داراشکوہ نے اپنی مشہور کتاب "سکینۃ الاولیاء" میں کیا ہے۔ مسجد کے ایوان کے ماتھے پر بڑی کمان کے اوپر چوکھٹ پر آیۃ الکرسی خطِ ثلث میں لکھی ہے۔ اس کے اخیر کاتب کا نام محمد شریف لکھا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا فاضل زمانہ تھا اور اس کا اکثر ذکر بعض تحریروں میں اور شاہجہان کے زمانے میں بھی اس کے حوالے ملتے ہیں مگر اسی ایوان مسجد وزیر خان کے اخیر جنوب آیاتِ قرآنی کے بعد کاتب حاجی یوسف کشمیری کا نام درج ہے جس کا نام تذکروں میں کہیں نہیں ملتا مگر حسنِ اتفاق سے بابا فغانی شیرازی کے دیوان کا ایک مخطوطہ لندن میں برنارڈ قوارچ کتاب فروشوں کے ہاں برائے فروخت آیا تھا جسے کاتب محمد یوسف کشمیری نے ۱۰۰۸ھ میں لکھا تھا، اسی طرح ایک کاتب محمد زمان بن حاجی یوسف کا حوالہ بھی ملتا ہے جو جرمنی میں بمقام میونک موجود ہے مگر حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی یوسف اس زمانہ میں اسی مسجد وزیر خان میں مؤذن تھے کیونکہ چند خطوط ہمیں مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ میں آپ کے نام ملتے ہیں جن میں ایک خط بنام حاجی یوسف مؤذن کو خطاب کیا گیا ہے، جن میں مسائل تصوّف زیرِ بحث ہیں۔ میرے خیال میں یہ اسی مسجد سے وابستہ تھے مگر بعد اورنگ زیب عالمگیر ایک اور مخطوطہ تاریخ "روضۃ الصفا" پونہ کے کتاب خانہ مرہٹہ تاریخ کے ادارہ میں محفوظ ہے جسے عبدالکریم بن حاجی یوسف نے بروز چہارشنبہ ۲۷ رجب ۱۱۰۰ھ بمقام "اسلام پوری" لکھا ہے جو آج علاقہ پونہ میں ہے، جبکہ اورنگ زیب وہاں پڑاؤ کیے ہوئے تھا اور ان کے کیمپ سے یہ کاتب متعلق تھا۔ اسی طرح دیگر اکثر علماء کا ذکر بھی تلاش سے میسّر آسکتا ہے افسوس ہماری تاریخ مُرتّب نہیں ہے کہ جس سے ایسے علماء کا پتہ چلے جو براہِ راست بادشاہی مسجد سے متعلق تھے۔

ملّا سعد اللہ وزیرِ اعظم شاہجہان کے ابتدائی حالات میں وضاحت سے ملتا ہے کہ آپ کو ملّا خواجہ بہاری سے کمال تعلق اور اعتقاد تھا اور علوم بھی آپ سے ہی حاصل کیے تھے۔ خواجہ بہاری حضرت میاں میرؒ کے مریدوں میں سے تھے تو ان کا انتقال لاہور میں اپنے پیر کے قدموں میں ۱۰۶۸ھ میں ہوا اور نزدیک غیاث پورہ متصل عالم گنج دفن ہوئے تھے۔ بعض روایات سے ملتا ہے کہ ملّا سعد اللہ نے ابتدا میں تعلیم حاصل کی اور میرے نزدیک وہ مسجد جس

میں ملاّ سعد اللہ نے تعلیم پائی اور وہیں فریضۂ امامت بھی ادا کرتے تھے۔ آج بھی لاہور میں اندرون دہلی دروازہ کے محلہ قصّاباں میں موجود ہے۔ ایک بزرگ دوست کے بیان کے مطابق شاہجہان بادشاہ نے بھی یہاں ایک مرتبہ نمازِ مغرب ملاسعد اللہ کے پیچھے ادا کی اور یہی واقعہ آپ کے بادشاہ سے تعارف اور عروج کا واسطہ بنا، جبکہ ملاسعد اللہ نے بادشاہ کو دیکھ کر جماعت کی۔ سورۃ النّاس دونوں رکعتوں میں آدھی آدھی تلاوت کی جس سے بادشاہ بہت متاثر ہُوا، کیونکہ یہ واقعہ بالکل غیر معمولی تھا اور شریعت کے عین مطابق تھا۔ اس کے بعد شاہی ملازمت میں لے لیے گئے اور ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے آخر وزیر اعلیٰ کے عُہدہ پر فائض ہُوئے۔ میرے نزدیک وہ مدرسہ جہاں آپ نے ملاّ خواجہ بہاری سے علوم حاصل کیے۔ آج بھی بصُورتِ مسجد نُور، لاہور چھاؤنی مغربی ریلوے سٹیشن سے امرتسر کو جاتے ہوئے ریلوے سڑک کے قریب موجود ہے۔ لوگ آج کل حضرت پیر کرمانوالا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ یہاں اس مسجد نور میں حضرت مجدد الفِ ثانی احمد سرہندی قدس سرہٗ نے بھی یہاں قیام کیا تھا۔ یہ مسجد نور مرجع اہلِ اللہ رہی ہے میں نے یہ مختصر بیان علمائے لاہور کے ضمن میں جن کا تعلق مساجد سے تھا، مختلف مآخذ سے بیان کیا ہے۔

عُلمار کی حق گوئی

مورخ ہاشم علی خافی خاں نے اپنی مشہور تاریخ "منتخب اللباب" (اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۹) میں لعنوان مندرجہ بالا اور ان کی کامیابی کے تحت لکھا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ نے خطبۂ جمعہ میں لفظ "وصی" داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر لاہور کے عُلمار نے خطبہ بند کر دیا اور بادشاہ اس وقت خود لاہور میں موجود تھا۔ اس نے علمار کو حاضر ہونے کا حکم دیا تو علمار لاہور میں سے حاجی یار محمّد اور محمّد مُراد تین چار مشہور علما۔ بادشاہ کے دربار میں باریاب ہوئے بادشاہ نے ان کو تسبیح خانہ میں بُلالیا اور بیٹھنے کا حکم دیا۔ علمار میں سے عبدالقادر خان بھی تھا جو قاضی میر کا بھتیجا تھا۔ دربار کے دو تین عُلماء کے ساتھ انھوں نے گفتگو کی۔ اور خود بادشاہ نے بھی حدیث کی معتبر کتابوں سے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمۂ دین کے اقوال اور روایات کا حوالہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ "وصی" پڑھنے کو ثابت کیا۔ لاہور کے علماء سے ایک زوردار مباحثہ ہوا۔ حاجی یار محمّدؒ نے بادشاہ کے قول کو از روئے شریعت اسلام گستاخانہ اور بے باکانہ طور پر رد کر دیا۔ بادشاہ نے غضبناک ہو کر کہا: "تم بادشاہوں کے غضب سے نہیں ڈرتے ہو کہ اس طرح شاہانہ مجلس کے آداب کے خلاف گفتگو کر رہے ہو"۔

حاجی یار محمد نے جواب دیا: "مجھے بخشندۂ حقیقی رب العزت سے چار چیزوں کی آرزو تھی: اوّل علم، دوم حفظ کلام اللہ، سوم حج اور چہارم شہادت (فی سبیل اللہ) الحمد للہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تین نعمتیں تو عطا فرما دیں۔ امیدوار ہوں کہ بادشاہ کی توجہ وعنایت سے اس میں بھی کامیاب ہو جاؤں۔"

غرضیکہ اس مسئلہ کی تحقیق و تنقیح میں چند دن لگ گئے اور اس معاملہ میں شہر کے عوام اور افغانوں کی ایک جماعت جو سب کے سب ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے، حاجی یار محمّدؒ کے حامی تھے۔ اور خفیہ طور پر حاجی یار محمّدؒ کے رفیق بن گئے تھے۔ شہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم بادشاہ بھی اس جماعت کا حامی تھا۔ بالآخر حاجی یار محمّدؒ کو کامیابی ہوئی۔ ماہ شوال کے آخیر میں صدر نے بادشاہ کے حضور میں خطبہ پڑھنے کی عرضداشت بادشاہ کے حضور میں پیش کی، بادشاہ نے دستخط فرما دیے کہ حضرت خلد مکان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے مطابق خطبہ پڑھا جائے یعنی بغیر لفظ "وصی" جو عام رواج تھا۔ چونکہ بادشاہ شاہ عالم کے اس فرمان اور دستخط کی اطلاع بہت کم لوگوں کو ہوئی تھی (خافی خان تاریخ منتخب اللباب صفحہ ۱۳۱) یہاں تک کہ

مقربانِ خاص بھی اس سے مطلع نہ ہوسکے تھے۔ ہزارہا آدمیوں کا ہجوم جس میں ہر قوم کے آدمی شامل تھے۔ اپنے اپنے دعویٰ اور رائے کا اظہار کرتے ہوئے مسجد (بادشاہی) کی اطراف میں جمع ہوگئے اور بعض فاسد خیالات کو رُوبعمل لانے کے لیے موقع کی تاک میں تھے اور کسی نہ کسی ہنگامہ اور فساد کا انتظار کر رہے تھے مگر جب مسجد میں منبر پر خطبہ قدیم دستور کے مطابق پڑھا گیا یعنی بغیر لفظ "وصی" ، جو لوگوں کا مقصد تھا تو یہ تمام قضیہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ بادشاہ نے آخیر مولانا حاجی یار محمد کو اور ان کے ہمراہ دو اور علماء کو گرفتار کرا کے قلعہ میں بند کر دیا۔

آخر شاہ عالم بادشاہ کا انتقال یہیں لاہور میں ۲۰ محرم الحرام ۱۱۲۴ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۷۱۲ء کو ستر سال کی عمر میں ہوا۔ اگرچہ منتخب اللباب کے مطالعہ سے دیگر تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا ان علماء متذکرہ بالا کا تعلق لاہور کی بادشاہی مسجد سے تھا۔ بہرحال ہم یہ ضرور تصوّر کرسکتے ہیں کہ جب خطبہ کا مسئلہ تھا جس میں لفظ "وصی" کا استعمال زیرِ غور تھا تو ممکن ہے یہ علماء یا خطیب و امامِ مسجد، بادشاہی مسجد بھی اس میں شامل تھے، جس پر براہِ راست گورنمنٹ کا تسلط تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں دیگر بڑی مساجد کے ائمہ اور خطباء بھی شامل ہوں۔

حصّہ ہشتم

خُطباءِ مسجد بادشاہی

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ مسجد بادشاہی کے ضمن میں کسی خاص عالمِ دین کا بیان خاص کر تعمیر مسجد سے لے کر انگریزوں کے قبضہ سے قبل تک نہیں ملتا، تاہم ہم نے لاہور کے اسلامی ماحول میں اس عہد کے دوران بعض علماء کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح لاہور سے ضرور تھا اور ان میں سے ممکن ہے بعض کا تعلق اس مسجد سے بھی تھا کیونکہ لاہور نے اس ضمن میں ہمیشہ بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بہرحال ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ بھیرہ کے قریب مقام "بگہ" کے علماء اس مسجد سے عہدِ انگلشیہ سے ضرور وابستہ رہے۔ جب مسجد مسلمانوں کو ۱۸۵۶ء میں واگزار کر دی گئی تو مسجد میں علومِ اسلامیہ کے ضمن میں قریب ایک صد روپیہ ماہوار خرچ ہوتا تھا مگر پھر کسی عالم کا نام سے ذکر نہیں ملتا حتّٰی کہ ۱۸۶۹ء سے باقاعدہ مولوی غلام محمد بگوی اس مسجد کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جب انجمن اسلامیہ لاہور نے باقاعدہ مسجد کے انتظام کو سنبھال لیا تھا اور خان محمد برکت علی خان اس انجمن کے سیکرٹری تھے۔

اتفاق سے ہمارے پیشِ نظر اس وقت "حدائق الحنفیہ" اور "تذکرہ مشائخ بگویہ" ہیں جن سے ہم افادہ کرتے ہیں کیونکہ خاندانِ بگویہ کے افراد اوّل اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ ویسے ہم نے مقام بھیرہ کا بھی اوپر ایک طرح کا اشارہ کیا ہے جو علومِ دین کا ابتداء سے مرکز رہا ہے اور بگہ وہاں سے کچھ دُور بھی نہیں ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے پر آباد ہے اور ان علماءِ دین کی وجہ سے آج بھی مشہور مقام شمار ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ علماء و مشائخ کا ایک خاندان قریہ بگہ میں عہدِ مغلیہ سے علومِ دین کی خدمت کر رہا تھا جس کا ایک فرد حافظ نور محمد مشہور عالمِ دین تھا۔ جب آفتابِ سلطنت کا غروب ہو رہا تھا تو اس کا فرد حافظ محمد شفا "صاحبِ کرامات"، "شاہ زندہ" کے لقب سے موسوم تھا چنانچہ ان کے لڑکے حافظ نور محمد نے اپنے دو لڑکوں مولوی غلام محی الدین اور حافظ احمد الدین کو علومِ دین حاصل کرنے کے لیے دہلی ارسال کیا تھا۔

مولوی غلام محی الدینؒ بگوی کے حالات میں لکھا ہے: جبکہ سکھوں کا زور تھا وہ علومِ دین حاصل کرنے کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور ان کے ہمراہ ان کے چھوٹے بھائی مولوی احمد الدین بھی تھے جو اتفاق سے آٹھ سال کی عمر میں تھے اور اپنے بڑے بھائی غلام محی الدین سے قریباً تیرہ سال چھوٹے تھے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی احمد الدین نے راستہ میں ہی دہلی پہنچنے سے پیشتر قرآن حفظ کر لیا تھا اور دہلی پہنچ کر انہوں نے مشہور عالمِ دین

شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالعزیز سے اکتساب علم کیا اور واپس لاہور تشریف لے آئے (حدائق الحنفیہ مؤلفہ مولوی فقیر محمد مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۸۶)

حافظ احمد الدین بگوی امام و خطیب مسجد بادشاہی

لاہور آکر مولوی غلام محی الدین نے 'لال مسجد' جو طبی بازار لاہور میں تھی قریب بیس سال تک طلبا، کو درس دیا، آپ کو 'استر خا' کی بیماری تھی وہ اپنے گاؤں بگہ میں دوشنبہ ۳۰ ماہ شوال ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی حافظ احمد الدین نے بھی اپنے بھائی کے ہمراہ علوم معقول و منقول عمدگی سے حاصل کیے تھے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ۱۸۶۹ء تک مسجد بادشاہی لاہور کے ضمن میں کسی امام یا خطیب کا تعلق معلوم نہیں ہوتا مگر محض اتفاق سے میری لائبریری میں ایک مختصر سا رسالہ بعنوان : "سنان الموحدین لدفع مطاعن الملحدین" موجود ہے جس میں "بدعت فی الدین" کے خلاف نہایت مدلل بحث کی گئی ہے اور اس رسالہ کے مصنف کا نام کہیں نہیں ملتا، البتہ لاہور میں طبع ہوا ہے اور اسے انجمن خادم الاسلام جموں باہتمام منشی سلطان محمود اسسٹنٹ سیکرٹری نے شائع کیا ہے۔ یہ کوئی انجمن برادران اہل حدیث جموں ہے۔ اس رسالہ کے صفحہ ۲۰ پر مندرجہ ذیل عبارت قابل مطالعہ ہے :

"درمختار میں جو حنفی مذہب کا زبردست ستون ہے، لکھا ہے : من قال شيئًا لله قيل يكفره فاذا كان مختلفًا فيها فالاحتراز واجب لانه لم يقل احد من العلماء يكونه فرضًا او سنةً او مندوبًا بل هو بدعته - فيه اشراك لله تعالى فی اثبات علم الغيب لاوليا الله و هم بريئون عنه النبی
شیخ پنجاب مولانا احمد الدین صاحب مرحوم بگوی امام مسجد شاہی لاہور بھی وظیفہ شیئاً للہ کو مردود اور ناجائز لکھتے ہیں"

اس مذکرہ بالا اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولوی احمد الدین بگوی نے کوئی مضمون یا کتاب لکھی تھی جس سے اس رسالہ میں استفادہ کیا گیا ہے اور شیخ پنجاب اور مسجد شاہی کا امام بھی لکھا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کا تعلق مسجد شاہی سے بالکل ابتداء سے ہی تھا کیونکہ آپ کے بڑے بھائی کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا جو لاہور میں مشہور و معروف عالم دین تھے اور درس بھی دیتے تھے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے جب ادھر یہ مسجد مسلمانوں کو برٹش نے حوالے کی تو ضرورت تھی کہ فوراً اس میں احیاء نماز اور علوم دین کا سلسلہ شروع کر دیا جائے چنانچہ اس شہادت سے واضح ہے کہ مولوی احمد الدین اس مسجد شاہی کے امام مقرر ہو گئے تھے۔

صاحب حدائق الحنفیہ نے لکھا ہے "آپ نے تصنیفات بہت کیں مگر نظر ثانی کی نوبت نہ پہنچی کہ لوگ لے گئے، از انجملہ ایک کتاب احمدیہ حاشیہ شرح ملا ہے جو بہت مشہور ہے۔ ایک حاشیہ خیالی ہے۔ آپ کی وفات ۱۳ شوال ۱۲۸۶ھ شب یکشنبہ کو ہوئی یعنی ۱۸۶۹ء اور یہ وہی سال ہے جب یہاں اس مسجد شاہی کے مولوی غلام محمد بگوی امام مقرر ہوئے، جیسا کہ ہم نے اوپر درج کیا ہے جو مولوی حافظ احمد الدین کے بڑے بھائی مولوی غلام محی الدین کے صاحبزادے تھے۔ مولوی احمد الدین صاحب صاحب کرامات تھے اور مسجد بھیرہ کو آپ ہی نے از سر نو تعمیر کیا تھا۔ آپ کے تلامذہ میں مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ، مولوی نور الدین چکوالی، حکیم نور الدین قادیانی، حکیم تاج محمود ہزاروی، مولوی محمد بخش جلالپوری، مولوی حافظ ولی اللہ صاحب مناظر اسلام لاہوری، حافظ صاحب اس مسجد شاہی کے مؤذن بھی تھے۔ مولانا غلام قادر بھیروی وغیرہ تھے، مگر مولوی غلام قادر بھیروی عرصہ تک لاہور میں بیگم شاہی (جہانگیر بادشاہ) کے امام تھے۔ راقم نے ان کو دیکھا ہے اور ان کے جنازے میں بھی شرکت کی ہے۔ اور نہایت ضعیف حالت میں میں نے ان کو دیکھا ہے حنفی المذہب تھے، انھوں نے مسجد بیگم شاہی کے ماتھے کی دیوار پر سنگ مرمر سفید پر کندہ کروا کر اعلان کیا ہوا تھا کہ کوئی غیر حنفی

ان کی مسجد میں آکر وعظ و ہدایت نہیں کرسکتا، خاص کر یہ اعلان نیچری، احمدی (قادیانی) اور وہابیوں کے لیے لکھا ہوا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ راقم نے ان کے پیچھے اکثر دفعہ نماز جمعہ ادا کی ہے جو لاہور کی سب مساجد سے دیر میں ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے۔ غرضیکہ مولوی احمدالدین کا بادشاہی مسجد کے ضمن میں تذکرہ نہایت دلچسپی کا موجب ہے اور اکثر علماء نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

ویسے لاہور میں ایک اور عالم دین مولوی غلام احمد صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ نعمانیہ میں بھی تھے اور وہ بہت بڑے عالم دین اپنے زمانہ کے تھے ان کے انتقال کے بعد یہاں لاہور میں غالباً ۱۹۱۰ء کے بعد ایک اور عالم دین مولوی غلام رسول آئے جو مدرس اعلیٰ مدرسہ نعمانیہ مقرر ہوئے تھے، جن سے مولوی غلام مرشد طال بقائہ نے بھی پڑھا ہے، جن کا ذکر ہم ذیل میں کریں گے۔ اس وقت ایک اور مولوی شاہ محمد بھی یہاں پڑھاتے تھے۔

غرضیکہ یہ وہ علمائے دین ہیں جنہوں نے کبھی نہ کبھی بادشاہی مسجد میں اگر امامت کے فرائض تو انجام نہیں دیئے مگر گمان ہے کہ کم سے کم نماز ضرور پڑھی ہوگی۔ مگر افسوس نہ مولوی احمدالدین اور نہ کسی اور عالم دین کا ذکر اس ابتدائی عرصہ میں مسجد کے ضمن میں ملتا ہے۔

اتفاق سے حافظ احمدالدین بگوی کے متعلق نور احمد چشتی نے اپنی کتاب "تحقیقات چشتی" (صفحہ ۱۳۲-۱۳۳) میں نیلا گنبد اور ملحقہ مسجد کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ اس مسجد میں قریب تیس چالیس لڑکے اس مسجد میں پڑھتے ہیں اور سن اٹھارہ سو باون (۱۸۵۲ء) سے اس مسجد کے امام مولوی احمدالدین صاحب بگہ والے مقرر ہوئے ہیں۔ ان کی طرف سے نائب ملّا نور احمد امام مسجد جوائی مقرر ہوا یعنی لاہور کے موتی بازار میں مسجد جوائی کنجری کا امام ہے اور میاں رحیم بخش سوداگر مولوی احمدالدین کو اپنے پاس سے ماہواری ارسال کرتا ہے اور تمام خرچ مسجد میاں رحیم بخش سوداگر کرتا ہے یعنی یہاں مسجد نیلا گنبد میں مدرسہ ابتدا سے ہی تھا اور آج بھی مدرسہ رحیمیہ کے نام سے قائم ہے۔ غالباً یہ اسی سوداگر رحیم بخش کی طرف اشارہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب لاہور میں مسجد بادشاہی کی واگزاری کا معاملہ عوام میں تھا۔ اس وقت بحیثیت عالم دین مولوی احمدالدین نے بھی کردار ادا کیا تھا جو ۱۸۵۶ء میں واگزار ہوئی تھی۔ اس لیے قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی احمدالدین بگوی ہی ۱۸۵۶ء سے اس مسجد بادشاہی کے واگزار ہونے پر باقاعدہ امام بھی بنائے گئے تھے۔ اگرچہ ہمیں کوئی باقاعدہ یادداشت اس ضمن میں نہیں ملتی اور ویسے روایتہً یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نے مسجد بادشاہی کی واگزاری کے لیے کوشش کی تھی۔ حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۶۹ء تک مسجد بادشاہی کے باقاعدہ خطیب تھے جیسا کہ میں نے اوپر بحوالہ "سنان الموحدین لدفع مطاعن الملحدین" بیان کیا ہے۔

مولوی غلام محمد بگوی

مولوی احمدالدین کی وفات پر انجمن اسلامیہ لاہور نے باقاعدہ طور پر مسجد کے انتظام کو سنبھال لیا تھا، چنانچہ اس وقت مولوی احمدالدین کے چچازاد بھائی یعنی مولوی غلام محی الدین کے لڑکے مولوی غلام محمد بگوی کو باقاعدہ بحیثیت ملازم انجمن ہٰذا مسجد کا امام مقرر کر دیا تھا اور ویسے مولوی احمدالدین کی وفات پر آپ کی کوئی نرینہ اولاد بھی موجود نہ تھی۔ بہرحال امامت مسجد خاندان بگویہ کے حوالے رہی۔ اتفاق سے میرے کتابخانہ میں ایک قدیم رپورٹ انجمن اسلامیہ لاہور کی ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی غلام محمد اس وقت انجمن ہٰذا کے آنریری ممبران میں بھی شمار ہوتے تھے۔ آپ یہاں اس مسجد سے اپنی وفات تک وابستہ رہے یعنی آپ کا انتقال ۴ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۰۰ء کو ہوا اور لاہور میں ہی قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہیں۔ راقم کا اکثر قبر کے قریب سے گزر ہوتا ہے۔ آپ بہت بڑے واعظ تھے اور متواتر تیس سال امام و خطیب مسجد ہٰذا رہے آپ کے زمانے میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن بھی تشریف لائے تھے انہوں نے طلبہ سے قرآن کریم کی تلاوت سنی اور فارسی زبان میں باتیں بھی کیں۔

جہاں دادخان نے نمازِ جمعہ پڑھائی

اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک عالم مہمان بھی اپنی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے کسی اور مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتا ہے چنانچہ انجمن اسلامیہ لاہور کی رپورٹ ۱۸۸۸ء کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس علیگڑھ کا ایک جلسہ خان بہادر محمد برکت علی خان کی دعوت پر لاہور میں منعقد ہوا اور بڑے پیمانے پر مہمانوں کی رہائش وسہولت کا انتظام کیا گیا تھا۔ سرسید احمد خان صاحب بانی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور ان کے رُفقا جن میں خاص طور پر قابل ذکر ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی، مولوی ذکار اللہ اور راجہ جہانداد خاں صاحب ہیں جنھوں نے تقریریں بھی کیں۔ یہ تمام اراکین ایجوکیشنل کانگرس بروز جمعہ بادشاہی مسجد میں برائے نماز جمعہ تشریف لائے تو اس روز راجہ جہانداد خان نے نماز جمعہ پڑھائی اور خطبہ بھی پڑھا اور نماز ادا کرنے کے بعد سرسیّد احمد خاں مع اپنے رُفقاء کے مسجد کے حوض کے کنارے پر تشریف لائے اور لوگوں کی مشتاق آنکھیں آپ کی زیارت سے مستفیض ہوئیں۔ اس روز خاص طور پر انجمن لاہور کے اراکین قاضی حمید الدین، مولوی احمد علی واعظ، مولوی غلام اللہ صاحب مدرس اسلامیہ امرتسر، مولوی محمد دین باغبان پُورہ بھی شامل تھے۔ یہ امرِ قابلِ بیان ہے کہ مولوی غلام محمد بگوی امام مسجد بھی موجود تھے انھوں نے بھی مہمان عالم کے اقتدا میں نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔

مولانا محمد شفیق بگوی

مولانا غلام محمد بگوی کی وفات پر آپ کے بعد آپ کے دوسرے فرزند مولانا محمد شفیق امام وخطیب مسجد بادشاہی مقرر ہوئے جن کو راقم نے بھی خوب دیکھا ہے۔ علاوہ امامت مسجد ہذا آپ لاہور میں گورنمنٹ کی فرمائش پر قیدیوں کو بھی وعظ ونصیحت سنٹرل جیل میں جاکر کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی آپ چیفس کالج یعنی ایچی سن کالج لاہور میں فرائض پروفیسری انجام دیتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ عید کے روز نہایت شان وشوکت سے مولوی صاحب تشریف لاتے تھے اور غالباً ۱۹۱۰ء کے قریب سالوں میں راقم نے دیکھا کہ عید کے روز سردار ایوب خان (افغانستان) جو لاہور مع اپنے افغانی احباب کے نظر بند تھے، نماز کے لیے تشریف لاتے تھے، ان کے ہمراہ دو اسپہ گاڑی میں ان کے صاحبزادگان بھی ہوتے تھے اور عید کے روز دوران خطبہ امام مسجد کو قزلباش خاندان کی طرف سے ایک دستار بھی رسمًا دی جاتی تھی۔ غرضیکہ یہ منظر بہت ہی دلکش ہوتا تھا اور لاہور کے اکثر رؤسا اس میں شرکت کرتے تھے۔

مولوی محمد شفیق امام مسجد بادشاہی کا انجمن اسلامیہ لاہور سے کچھ اختلاف ہوگیا جس کا ذکر باشارہ لاہور کے اخباروں یعنی زمیندار ۲۲-۲۹ اگست ۱۹۱۹ء میں بھی ہے تو آپ ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۷ء) میں امامت مسجد سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن بُگہ واپس چلے گئے اور آخر اپنی اراضی موضع مسن تحصیل وضلع شیخوپورہ میں مقیم ہوگئے۔ آپ کے دو صاحبزادے مولوی مشتاق احمد اور حافظ نیاز احمد تھے۔

مسجد کے مؤذّن

جب مسجد باقاعدہ انجمن اسلامیہ لاہور کے زیر انتظام آگئی اور امام مولوی غلام محمدّ بگوی مسجد کے ۱۸۶۹ء سے ہوگئے تھے تو ان کے ہمراہ باقاعدہ طور پر مسجد کے مؤذّن حافظ ولی اللہ تھے۔ آپ لاہور کے باشندہ تھے، تبحرِ علمی کی وجہ سے اکثر وعظ بھی کہتے تھے، خاص کر تردید نصاریٰ میں آپ کو وہ ملکہ تھا کہ بڑے بڑے پادری بھی آپ سے مناظرہ میں کنارہ کشی کر جاتے تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بر وقت کسی مجلس کی رُوداد یا کسی مسئلہ یا کسی علمی بات کے متعلق شاگرد سے کتاب

کی عبارت پڑھوا کر صفحہ یا سطر کا حوالہ پوچھ لیتے، پھر کبھی نہیں بھولتے تھے۔ آپ کے علوم کو مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے اور مولوی نور محمد ساکن کھائی کوٹلی اور نیز متذکرہ بالا مولوی احمد الدین بگوی سے پڑھا تھا۔ آپ کو فقہی مسائل میں خاص دسترس تھی، اکثر لوگ آپ سے فتاویٰ لکھواتے تھے۔ ہر جمعہ کے روز آپ بادشاہی مسجد میں بعد نماز جمعہ وعظ فرماتے اور ہزاروں لوگ مستفید ہوتے۔ آپ کا لاہور میں ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) میں انتقال ہوا۔

جب مولوی غلام محمدؐ کے بعد آپ کے صاحبزادے مولوی محمد شفیق مسجد کے خطیب تھے تو آپ کے ہمراہ مؤذن مولوی عبدالقادر تھے، جن کو راقم نے بھی خوب دیکھا ہے۔ ان کا رنگ قدرتی طور پر سیاہ تھا اور پتلے دُبلے سے ذرا زیادہ لمبے تھے۔ اس وجہ سے ہم ان کو آپس میں لفظ "غراب" سے تعبیر کیا کرتے تھے اور ذرا ظریف الطبع بھی تھے۔ مگر اسی زمانہ میں ہی ایک اور صاحب مولا بخش بھی فرائض مؤذن کبھی کبھی ادا کرتے تھے اور کبھی کبھی مکبّر کی حیثیت سے بھی یہ فریضہ ادا کرتے۔ میرا خیال ہے کہ مولا بخش کے بعد ان کا لڑکا جو حافظِ قرآن بھی تھا وہ آج تک یہی فریضہ ادا کرتا رہا یعنی مولانا غلام مرشد کے زمانے تک وہ متعین رہا

مسجد میں مدرسہ علومِ اسلامیہ اور بعض عُلمائے دین

برٹش عہد کے زمانہ میں ابھی مسجد کا انتظام انجمن اسلامیہ کے زیر نہیں آیا تھا اور ایک طرح یہ مسجد اپنے انتظام کے اعتبار سے برٹش کی اعانت سے ہی چلتی تھی تو معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کا انتظام بالکل ابتداء ۱۸۵۶ء سے ہی کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی انتظام کے تحت مولوی حافظ احمد الدین بگوی بھی اس سے علاوہ فرائض خطیب یا امامت کے منسلک تھے کیونکہ ۱۸۶۸ء کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صد روپیہ ماہانہ عربی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے

راقم نے بھی ۱۹۱۰ تا ۱۹۱۷ء کے سالوں میں دیکھا کہ باقاعدہ طلبائے علوم اسلامیہ مسجد کی مغربی دیوار کے جنوبی حصّہ میں رہائش رکھتے تھے اور یہاں مولانا معین الدین اجمیری بھی پڑھاتے رہے ہیں۔ مَیں نے اکثر آپ کو سردیوں کے زمانہ میں حوض پر طلباء کو پڑھاتے دیکھا۔ خاصکر آپ منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ وہ اس فن میں اس وقت امام شمار ہوتے تھے اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے خاندان سے تھے۔

مَیں نے اس مسجد میں ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء کے سالوں میں جب مولوی محمد شفیق مسجد کے خطیب تھے، ان کے زمانے میں اکثر ایک فرشتہ سیرت وصُورت شخص کو مسجد کے دروازے کے قریب ہی بڑ کے درخت کے نیچے عام طور پر نمازیں اکثر مصروف دیکھا کرتا تھا۔ آپ کا اسم گرامی مولانا الحاج محمد ذاکر ہے۔ آپ دراصل مولانا عبدالعزیز بگوی برادر مولانا غلام محمد بگوی کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ آپ کی تعلیم بھی دہلی میں ہوئی تھی۔ آپ کا تذکرہ مفصّل ویسے تذکرہ مشائخ بگویہ میں دیا ہے۔ آپ کو دیکھنا کسی بزرگ مقدس کا دیکھنا تھا۔ مَیں نے ایسا نورانی چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ آپ مولوی غلام محمد بگوی کے داماد بھی تھے۔ لاہور میں مدرسہ حمیدیہ میں پڑھاتے تھے اور اکثر طلبہ آپ سے اس مسجد میں مستفید سبق ہوتے تھے۔ آپ کی وفات کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بمقام سیال تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپ نے طلبۂ مدرسہ حمیدیہ کو لائبریری کی کتابیں واپس کرنے کو کہا اور تمام کاغذات وغیرہ جو آپ کے ذمّہ تھے مکمل کر کے انجمن حمایت اسلام کے کارکنوں کے پاس ارسال کر دیے۔ اس کے بعد بروز جمعہ ۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۴ھ عارضہ بخار ہوا، چند لوگ عیادت کو آئے، اُن سے کہا کہ ہم جمعہ کے روز پہنچ جائیں گے چنانچہ آئندہ جمعہ کو آپ کا انتقال ہوگیا (بتاریخ ۲۰ جنوری ۱۹۱۶ء)۔ نماز جنازہ مسجد وزیر خاں لاہور میں ہوئی اور دوسرے دن صبح کو آپ کا جنازہ بھیرہ پہنچا دیا گیا۔

لاہور میں ایک مسجد گنپت روڈ پر ذرا اندر کر کے ہے اُس پر لکھا ہے "مسجد حفظ الاسلام" جو دراصل دو بھائیوں حفظ الاسلام اور عین الاسلام کی طرف اشارہ ہے جو لاہور میں بہت مشہور و معروف تھے۔ ہر دو بھائی نواب محمد صادق خان ثانی بہاولپور (متوفی سنہ ۱۳۱۰ھ) کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور میں اپنے تبحرِ علمِ دین کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ انھوں نے اکثر اسی مسجد میں نماز ادا کی اور امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ لاہور میں یہ مسجد اُن کی آبادی ہوئی ہے

اور آج اُن کو کوئی نہیں جانتا۔ بہاولپور میں اُن کو منصب قاضی القضاۃ پر فائض کیا گیا اور نسلاً بعد نسل اس عہدہ پر فائز رہے افسوس آج اُن کو نہ کوئی لاہور میں جانتا ہے اور نہ بہاولپور میں اسی طرح بے شمار علماء ہیں جو ان مساجد سے والبستہ رہے۔

بادشاہی مسجد لاہور سے متعلق اکثر علماء کے اسماء ملتے ہیں جن کی اسلامی اور تعلیمی خدمات کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں شمس العلماء مولانا مولوی عبداللہ ٹونکی کا ذکر کیا ہے جن کا اپنا ذاتی کتب خانہ اسی مسجد کے دالانوں میں شمال کی طرف کئی سال مسجد کی زینت رہا مفتی عبداللہ ٹونکی یہاں اورینٹل کالج میں قریب ۳۴ سال یعنی ۱۸۸۳ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک معلّم رہے۔ آپ کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۲۰ء میں بھوپال میں ہُوا۔ اس عرصۂ قیامِ لاہور میں آپ کی نشست عموماً بادشاہی مسجد میں رہتی تھی اور اکثر آپ نے امامت اور خطیب کے فرائض بھی ادا کیے تھے، مگر یہ حقیقت ہے کہ جو فتوے عام طور پر لوگوں کے لیے یا عوام کی درخواست پر رقم ادا کر کے جاری کیے جاتے تھے، ان میں مفتی عبداللہ ٹونکی کا دخل تھا۔ آپ اس زمانہ میں ایک مستند سرکاری مفتی کی حیثیت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال چونکہ ان کے ہمسایہ بھی بھاٹی دروازہ میں تھے اور ان سے اکثر مستفید بھی ہوتے تھے، بطورِ مثال کہا کرتے تھے۔ انھوں نے مفتی کی حیثیت سے ایک رسالہ 'اکل الغراب' یعنی کوّے کے کھانے پر لکھا ہے۔ انہوں نے ابتداء میں مولانا احمد علی محدث اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے پڑھا تھا۔ اس کے علاوہ آپ انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی بحیثیت صدر منسلک تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے اکثر سالانہ جلسوں میں آپ نے صدارت بھی کی تھی۔ اس کی تصدیق جلسوں کی رپورٹوں سے میسّر آسکتی ہے۔ ویسے راقم نے بھی اکثر صدارت کرتے آپ کو دیکھا ہے۔

لاہور میں مفتی صاحب کی وجہ سے بعض دیگر فضلاء و عُلماء بھی یہاں تشریف لائے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے کسی نہ کسی طریق سے شاہی مسجد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر مولوی محمد شعیب جن کا تعلق اورینٹل کالج سے تھا مولوی سید طلحہ متوفی ۱۳۹۰ھ بھی یہیں مدرس تھے، مولوی معین الدین اجمیری، مولوی محمد عمر خاں پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، یہ ٹونک کے باشندہ تھے۔ اسی طرح پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا بھی ذکر لازمی ہے، جن کو مفتی صاحب لائے تھے۔

اس ضمن میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ انجمن حمایت اسلام لاہور نے ایک مدرسہ "تعلیم القرآن" کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں جاری کیا تھا۔ جس میں خاصکر قاضی خلیفہ حمید الدین متوفی ۱۸۸۷ء بحیثیت معلّم قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی وفات کے بعد اس مدرسہ کا نام ان کے نام پر مدرسہ حمیدیہ کہلانے لگا۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۱ء سے انجمن حمایت اسلام کی خواہش پر بادشاہی مسجد سے ملحق کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے مولوی مُحمد ذاکر بُگوی کا قیام اکثر اسی مسجد بادشاہی میں رہتا۔ حالانکہ وہ مدرسہ حمیدیہ سے متعلق تھے۔ اسی طرح دیگر علماء کا بھی تعلق مسجد سے ضرور ہوگا جیسا کہ مولوی عبدالعزیز دیوبندی جو باشندۂ ملتان تھے۔ اس مسجد سے ۱۹۲۰ء سے غالباً ۱۹۳۶ء تک متعلق رہے۔ راقم نے بھی ان سے "حمداللہ" پڑھا ہے۔ اور وہ عام طور پر طلباء کو فلسفہ اور منطق کی کتب پڑھاتے تھے اسی زمانے میں ایک اور صاحب مولوی محمد امین بھی مسجد کی دیکھ بھال میں کوشاں نظر آتے تھے۔

مگر اس مسجد کے گرد و نواح کے اعتبار سے ایک اور امر کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت یہ ہے کہ اس مسجد کے سامنے حضوری باغ میں شمال کی طرف روشنائی دروازہ کے مشرق کی طرف اوپر جو مکان ہیں ان کو کبھی پٹواریوں کے لیے سکول قائم کیا گیا تھا کیونکہ تحصیلدار بھی کبھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے بعد یہی مکانات طلباء اورینٹل کالج کے ہوسٹل میں منتقل ہو گئے تھے مگر پھر اس کے بعد یہ اورینٹل کالج ہوسٹل مستقل طور پر سامنے جنوب کے حصہ عمارت میں آگیا جبکہ اس کی ہر دو منزلوں میں طلباء رہتے تھے یعنی مغربی حصہ میں مسلمان طالب علم اور مشرقی حصہ میں ہندو طلباء رہتے تھے اور ہر دو حصوں کے طلباء ایک طرح مشرقی علوم کے طلباء کہلاتے تھے۔ یہ انتظام غالباً ۱۹۳۷ء تک رہا جس کے بعد جب اورینٹل کالج ہوسٹل کی مستقل جہاں آج کل اورینٹل کالج سے ملحق ہے طیار ہوگئی تھی تو ہوسٹل اس میں آگیا تھا۔ ورنہ اس حضوری باغ میں اس ہوسٹل اور ساتھ ہی بادشاہی مسجد کی وجہ سے خاصا علمی ماحول نظر آتا تھا۔ ایک طرح یہ تمام ماحول بادشاہی مسجد سے ہی متعلق نظر آتا تھا۔ راقم کو اس ہوسٹل کے بعض مقیم اساتذہ کا تلمّذ بھی حاصل رہا ہے جو اگرچہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا۔

مولوی محمد شفیق کے معاصرین میں ایک خاندان مسجد کے ملازمین میں شمار ہوتا تھا جو خاموش طور پر مسجد کی خدمت کرتا رہا۔ اس خاندان کی خدمات حافظ اللہ بخش سے شروع ہوئیں۔ ان کے بعد ان کا لڑکا مولوی محمد دین قریشی صدیقی انجام دیتا رہا اور خاص کر تبرّکاتِ عالیہ کا محافظ رہا جن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہُوا اور ان کے بعد اسی خدمت پر ان کا لڑکا مولوی فضل حسین متعین رہا جس کا انتقال غالباً ۱۹۶۱ء میں ہُوا، اور یہ شخص راقم کا ہم مکتب رہا ہے یعنی انھوں نے مولوی غلام مرشد کا زمانہ خطابت خوب دیکھا ہے۔

خُطباءِ مسجدِ شاہی (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۷ء)

مسجد بادشاہی کا متذکرہ بالا زمانہ قریب دس سال ایسا عرصہ ہے جبکہ ہم کسی خطیب کو مستقل طور پر بیان نہیں کر سکتے اور انجمن اسلامیہ کے سامنے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مولوی محمد شفیق کے بعد انجمن اسلامیہ لاہور نے اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر مولانا احمد علی صاحب کو جو فارسی کے پروفیسر تھے خطیب مقرر کیا، وُہ جمعہ کے روز خطبہ دیتے۔ ان کے بعد انجمن نے باقاعدہ طور پر رامپور کے مولوی سیّدان حسین کو خطیب مقرر کیا اور وہ کئی سال تک خطیب رہے۔ اسی اثناء میں مدرسہ نعمانیہ کے بعض علماء بھی حصّہ لیتے رہے اور ان میں خاص کر علماء مدرسہ نعمانیہ کا بھی کچھ حصّہ ہے جن میں مولانا ہدایت رسول رامپوری اور مولانا ولی محمد جالندھری اور مولانا دیدار علی صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اس مدرسہ میں شمولیت کی وجہ سے عام طور پر نمازِ جمعہ بھی یہیں ادا کرتے اور وہ اکثر اوقات بطور فضیلت و مہمان خطابت بھی بروز جمعہ ادا کرتے تھے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے۔ اس کے رُوحِ رواں اور ہر دلعزیز مولوی عبدالقادر قصوری وکیل تھے اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہُوا جو موجودہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے عقب میں واقع ہے۔ راقم نے اتنے علمائے دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا اور نہ آج تک پھر ایسا جلسہ ہی ہُوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ یہ تمام کیفیت میری آنکھوں کے سامنے ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت اوّل رانچی کے جیل خانہ سے رہا ہو کر سیدھے لاہور صدارت کے لیے آئے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرارت مولانا طاہر دیوبندی نے کی تھی اور صدارت مولانا آزاد کی تجویز کی تائید میں کئی علماء نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا فاخر کانپوری نے کی تھی وُہ ایک شاہکار تھا۔ خطبۂ صدارت کو مولانا آزاد نے خود، اور کچھ حصّہ کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور کچھ حصّہ کو مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اسی جلسہ میں اوّل مرتبہ میں نے خود علامہ اقبال اور علامہ سیّد انور شاہ کشمیریؒ کا تعارف کرایا تھا۔ کئی ہستیاں علماء کی جنھوں نے شرکت کی تھی، ایسی تھیں کہ ان کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس ہفتہ قیام لاہور میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو جو جمعہ کا دن آیا، اس روز آپ بادشاہی مسجد تشریف لے گئے اور ان کے ہمراہ دوسرے علماء بھی تھے آپ نے ہی خطبۂ جمعہ پڑھا اور آپ نے ہی امامت کی تھی اور خاصکر خطبے کا موضوع کلمہ استغفار تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں جب مسجد میں نماز کے لیے داخل ہو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف العمر شخص یہ کلمہ بڑے خلوص و خضوع سے پڑھ رہا تھا جس کا مجھ پر بہت اثر ہُوا تو آپ نے خطبہ اس طرح شروع کیا :

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ

آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ کلمۂ استغفار نہایت ہی موثر وظیفہ ہے۔ ایک مومن مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا وظیفہ ہو سکتا ہے۔ مجھے خدا را بتلایا جائے کہ ان مسلمانوں کا حشر کیا ہوگا جنھوں نے گزشتہ عالمگیر جنگ میں ترکوں کے سینوں کو انگریز کے حکم سے چھلنی کیا ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا ان کے لیے سوا اس استغفار کے ان کی معصیّت عظیم کا کفّارہ ہو سکتا ہے۔ جب آپ خطبہ دے رہے تھے، اکثر حاضرین مسجد آبدیدہ تھے اور تمام مجمع مسحور تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت لاہور میں یہ سب سے بڑا جلسہ جمعیتہ العلماء دراصل انگریز کی حکومت کے خلاف ہُوا تھا اور بیشمار علماءِ اسلام قیدخانوں میں قید کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ انھوں نے ایک طرح اس جنگِ عظیم میں انگریزوں کے رویّہ خلافِ اسلام اور بالخصوص ترکوں کے حق میں شدید احتجاج کیا تھا اور بیشمار اس وجہ سے بھی قید کر دیے گئے تھے کیونکہ انھوں نے انگریز کے خلاف فتوی دیا تھا کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہیے۔ ادھر گورنمنٹ نے وہ فتوائے علماءِ اسلام ضبط کر لیا تھا جو علمائے اسلام نے مسلمانوں کی بھرتی کے خلاف دیا تھا۔

یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہم کسی خاص عالمِ دینِ اسلام کا تعلق بحیثیت خطیب بادشاہی مسجد کے بیان کر سکیں اور انجمن اسلامیہ کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اتفاق سے علامہ اقبال مرحوم کے ذہن میں ایک تجویز یہ آئی کہ اس منصب خطابت اور امامت مسجد شاہی کے لیے ایک ایسا باوقار اور اعلےٰ عالمِ دین کو لایا جائے جو صحیح خطبہ دے اور لوگ اس سے باقاعدہ مستفید ہوں، اسی اثنا میں مارچ ۱۹۲۵ء لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ اس انجمن کے رُوح و رواں مولوی احمد علیؒ تھے، جس میں خصوصیت سے علماء دیوبند نے شرکت کی تھی جن میں قبلہ سیّد انور شاہ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہ خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں ان تمام علماء نے شرکت کی تھی، اس میں مرحوم مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی مدعو تھے اور علامہ اقبال کے سامنے اس وقت محض یہ مدِنظر تھا کہ کسی طرح علامہ سیّد انور شاہ صاحب کو ان سے استفادہ کرنے کے لیے مستقل طور پہ یہاں لایا جائے۔ چنانچہ اتفاق سے ۱۹۲۶ء میں مدرسۃ العلوم اسلامیہ دیوبند کے اندرونی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی جن کی وجہ سے حضرت علامہ سیّد انور شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہٗ مدرسہ دیوبند چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

چند مخیّر مسلمانانِ گجرات کاٹھیاوار نے خاص طور پر سیّد انور شاہ صاحب کی شخصیت اور علمیّت سے استفادہ کرنے کے خیال سے ایک نیا مدرسہ بمقام ڈابھیل (ریاست بڑودہ) میں قائم کرنے کی تجویز کی اور آپ کو وہاں ڈابھیل میں اس مطلب کے لیے قیام کی دعوت دی مگر ادھر علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح لاہور میں ہر دو انجمن اسلامیہ اور انجمن حمایت اسلام دونوں مل کر ان کو یہاں آنے کی دعوت دیں اور اس طرح اہل لاہور آپ کی اعلیٰ علمیّت سے مستفید ہوں چنانچہ اس سے قبل ایک مرتبہ علامہ سیّد انور شاہ صاحب لاہور میں اتفاق سے تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرون موچی دروازہ و رنگ محل لاہور) پیر عبدالغفار شاہ ۲ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ کے ہاں مہمان تھے اور ان کی دعوت پر اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں وعظ کہا، اس وقت ادھر آپ کی موجودگی لاہور میں علامہ اقبال نے ہر دو متذکرہ بالا انجمنوں سے معاملہ فہمی بھی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علومِ دینِ اسلام کے سربراہ بھی ہونگے کیونکہ علّامہ اقبال کے سامنے ایک امر یہ بھی ذہن میں تھا کہ جس طرح یہ بادشاہی مسجد عظیم الشان ہے اسی طرح یہاں ایک اعلیٰ بلند پایہ خطیب بھی ہونا چاہیے جس کا سلسلۂ خطابت عالمِ اسلام میں بھی مقبول ہو، مگر افسوس ہے کہ اس وقت کسی قدر حضرت قبلہ سیّد انور شاہ صاحب کے اپنے بعض نظریات یہاں آنے میں حائل ہُوئے۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے پہلے موجودہ انتظامات میں ان کی شخصیت کی وجہ سے کسی کی حق تلفی ہو۔

غرضیکہ ان حالات میں بادشاہی مسجد لاہور کی امامت اور خطابت کے فرائض کے لیے ان سالوں میں کوئی خاص شخص قابلِ بیان نہیں اگرچہ انجمن اسلامیہ کے سامنے یہ بہت اہم مسئلہ تھا اور مسجد میں دوسرے انتظامات مدرسہ وغیرہ ٹھیک تھے اور بعض طلباء مدرسہ بادشاہی مسجد مدرسہ نعمانیہ میں تعلیم کے لیے جاتے تھے جو اس مسجد بادشاہی سے چند قدموں کے فاصلے پر آج بھی موجود ہے اور ان سالوں میں وہاں صدر مدرس مولوی غلام مرشد تھے، جو مدرسہ نعمانیہ کے ہی فارغ التحصیل تھے، جس کے بعد مدرسہ دیوبند سے دستارِ فضیلت حاصل کر چکے تھے اور اس کے بعد انھوں نے مدرسۂ معینیہ اجمیر سے بھی

سند حاصل کی ہوئی تھی اور اہلِ لاہور آپ سے بحیثیت عالمِ دین ابھی تک پوری طرح متعارف بھی تھے۔

مساجدِ لاہور میں درسِ قرآن

لاہور کی حیثیت دینِ اسلام کی ترویج کی تاریخ میں عجیب غریب ہی ہے یعنی اس زمانہ میں مسجد چینیاں میں درس قرآن کریم کا سلسلہ تھا، جہاں مولوی عبدالواحد غزنوی مرحوم درس قرآن دیتے تھے۔ انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ کی مسجد میں مولوی احمد علی صاحب درس دیتے تھے۔ موچی دروازہ پیپل وہڑہ کی مسجد میں مولوی نجم الدین اورنیٹل کالج کے پروفیسر درس قرآن دیتے تھے اور تکیہ سادھواں کی مسجد میں مفتی عبدالقادر کشمیری درس قرآن بعد نماز مغرب دیتے تھے ــــــ اور جب مولوی غلام مرشد کے تلامذہ کا دائرہ وسیع ہُوا اور شہرت نے بھی زور پکڑا تو بازار بزاز ہٹہ کے چند مسلمانوں نے تجویز کیا کہ اس کے اندر مسجد کناری بازار میں درس قرآن ہو جس کے لیے خصوصیت سے اس علاقے کے بابو عبداللہ مرحوم جو محکمہ تعلیمات پنجاب سے منسلک تھے، انھوں نے چند رُفقاء سے مل کر کوشش کی کہ مولوی غلام مرشد صاحب ان کی مسجد میں صبح بعد نماز درس قرآن دیا کریں۔ چنانچہ یہ درس شروع ہُوا۔

مولوی غلام مرشد کا طرزِ بیان دوران درس قرآن زیادہ تر بطور محقق پروفیسر ہی رہا۔ میں باقاعدہ حاضر ہوتا اور دیگر احباب بھی جن میں خصوصیت سے پروفیسر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر نذیر، مولوی محمد بخش مُسلم و سیّد عبداللہ و دیگر حضرات ضرور باقاعدگی سے شامل ہوتے اور اکثر اوقات اہلِ لاہور سے مختلف جماعتوں کے لوگ شامل ہوکر بعض سوال بھی کرتے اور علمی بحث کا دائرہ وسیع ہو جاتا مگر مولوی صاحب نہایت عمدگی سے علمی رنگ میں ہر ایک کی تسلی کرتے۔ اس کے بعد یہی سلسلہ درس بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں بھی شروع ہُوا مگر یہ درس عام طور پر بعد نماز مغرب ہوتا رہا اور جب مولوی صاحب باقاعدہ انجمن اسلامیہ لاہور کی ملازمت میں بحیثیت خطیب بادشاہی مسجد آگئے تو صبح کا درس بجائے کناری بازار کے لاہور کی مرکزی مسجد شہری میں شروع ہو گیا جہاں زیادہ لوگ آتے۔

لاہور کی تاریخ میں ۱۹۲۷ء کا زمانہ بہت ہی ہنگاموں کا تھا کیونکہ اسی سال لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب ہوئے اور لاہور کی طرف سے علامہ اقبال امیدوار تھے جبکہ مسلمانوں کو کسی سچے مسلمان نمائندہ کی سخت ضرورت تھی۔ ادھر علماء میں ایک طرح مولوی غلام مرشد صاحب ہی زیادہ مشہور تھے اور عوام آپ سے ہی زیادہ رجوع کرتے تھے۔ اور ان دنوں علامہ اقبال ایک خاص کتاب لکھنے میں مصروف تھے جو دراصل مدراس کے لیکچروں کی صورت میں لکھی گئی تھی جو اگرچہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں مدراس، بنگلور، میسور، حیدرآباد دکن اور علیگڑھ میں دیے گئے تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں علامہ اقبال نے اکثر علماء سے بھی بعض مسائل پر بالمشافہ گفتگو کی اور آزادانہ طور پر مشورہ بھی کیا، میں خود اکثر علماء لاہور کو علامہ کی خدمت میں برائے مشورہ اور استصواب لے گیا تھا جن میں لاہور کے علماء میں سے قبلہ مولوی اصغر علی روحی، مولوی حشمت علی اہلِ قرآن جماعت، مولانا سید طلحہ، مولانا غلام مرشد صاحب، خواجہ احمد الدین امرتسری شامل ہیں۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہے مگر میں نے بطور یادداشت ان علماء کے نام یہاں پیش کر دیے ہیں۔

اسی درس قرآن کی بدولت مولانا غلام مرشد نے تمام لاہور میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی اور کافی مشہور بھی ہو گئے تھے۔ راقم بھی ۲۱-۱۹۲۰ء کے سالوں میں آپ کے اسباق میں باقاعدگی سے مدرسہ نعمانیہ میں بغیر کسی رسمی داخلہ کے شامل ہو کر مستفید ہُوا۔ آپ لاہور کی اکثر تقاریب میلاد النبی، معراج النبی، شب برات، عیدین وغیرہ کے موقعوں پر لاہور کے مختلف محلوں میں وعظ بھی فرماتے تھے۔ آپ کے بیان میں خاص علمی جھلک ہوتی اور اکثر علمی نکات واضح ہو جاتے جو عام طور پر کتابوں کے مطالعہ سے بھی حل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان تمام علمی محفلوں کا منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لاہور میں عام طور پر دو خیالات کے لوگ رہتے ہیں، ایک تو وہ جو اپنے غلو کی وجہ سے وہابی کہلاتے ہیں اور ایک اس کے برعکس، وہ جو بریلوی

کہلاتے ہیں مگر میں ان سب کو فروعات میں شمار کرتا ہوں۔ چنانچہ مولوی غلام مرشد کے درس قرآن میں بعض اوقات اس قسم کے مسائل اور عقائد پر سوال و جواب زیر بحث آتے، مگر آپ اپنے تبحرِ علمی کی وجہ سے اس عمدگی سے عوام کی تسلّی کرتے کہ کوئی شک و شبہ نہ رہتا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے معقولات میں خاص قابلیت عطا کی ہے جو کسی ملک کے بڑے مفتی کی شان ہوتی ہے۔ لاہور میں علم الغیب اور یا رسُول اللہؐ کی بحث ہمیشہ رہی اور رہے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ لاہور میں طاعون کا زور تھا اور لوگ نہایت پریشان تھے۔ لوگ رات کے وقت مکانوں پر اذان دیتے تاکہ وبا دُور ہو جائے۔ اس وقت ایک ہنگامہ سا ہوتا اور خاص سماں پیدا ہو جاتا کیونکہ بغیر کسی نماز کے اذان کا دینا تعجب تھا بعض اوقات ان اذانوں میں اور عشاء کی نماز کی اذان میں گڑبڑ ہو جاتی۔ کسی شخص نے اس ماحول سے متأثر ہو کر مولانا سیّد عبدالواحد غزنویؒ خطیب و امام مسجد چینیاں والی محلہ چابک سواراں سے دریافت کیا: حضرت، اس بارے میں کیا حکم ہے کہ لوگ اس طرح اذان دیتے ہیں، کیا اسلام اس طرح کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ تو آپ نے ذرا تبسّم کے ساتھ فرمایا، اس سے تو بہتر ہے کہ لوگ " یا شیخ سیّد عبدالقادر شیئاً للہ " کے نعرے لگاتے ہیں۔ اسی طرح ایک روز مولوی غلام مرشد کے درس میں کسی نے سوال کیا: " کیا ہمیں یا رسُول اللہؐ کہنا چاہیے یا نہیں "؟ آپ نے نہایت عمدگی سے مفتیانہ رنگ میں مختصر جواب دیا: " ہم ہر روز ہر نماز کی دوسری رکعت میں التّحیات پڑھتے وقت کہتے ہیں: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ " یعنی سلام ہووے اوپر تیرے اے نبیؐ اور رحمت خدا کی "۔ اس کے بعد مسئلہ علم الغیب پر لوگوں میں شہر میں گفتگو شروع ہو گئی، حتّیٰ کہ یہ خبر لاہور سے بطورِ بازگشت امرتسر تک پہنچی تو مرحوم مولوی ثناء اللہ امرتسری سے بھی کسی نے اس کو نقل کیا تو اس کے بعد مولانا ثناء اللہ سے بھی بالمشافہ ان کے اپنے مکان امرتسر پر گفتگو کی نوبت آئی، تو مَیں خود اپنے استادِ محترم مولانا غلام مرشد کو ایک جمعہ کے روز مولوی ثناء اللہ سے پہلے طے کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ ہمارے ہمراہ مولوی غلام مرشد کے طالب علم سیف الرحمٰن بھی تھے۔ چنانچہ امرتسر میں مولانا ثناء اللہ کے مکان پر دو تین گھنٹے مختلف الفیہ مسائل پر دل کھول کر نہایت عالمانہ گفتگو اچھے ماحول میں ہُوئی۔ یہ تمام سماں سننے اور دیکھنے کے قابل تھا یعنی ایک طرف تو دُنیا کا تسلیم شدہ مناظر مولوی ثناء اللہ کٹر اہلحدیث اور ادھر ایک مدرس علوم اسلامیہ جو ہر روز معقولات و منقولات اور صحاح ستّہ ایک حنفی مدرسہ میں پڑھاتا ہے۔ مَیں نے اس وقت سے آج تک اس طرح بردباری سے اور دوستانہ ماحول میں دو مختلف فیہ مسائل پر مختلف خیال کے دو علماء کو گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ مَیں اس میں ایک طرح مولوی غلام مرشد کی عظمت سمجھتا ہوں کہ وہ اس طرح مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے دوسرے عالم کے مکان پر اور اس کے شہر میں خوشی خوشی تشریف لے گئے۔ آپ نے دیوبند جیسے ماحول میں جہاں مولانا محمود حسن شیخ الہند اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسے مقتدر عُلماء تھے، تعلیم حاصل کی۔

مولوی غلام مُرشد خطیب مسجد بادشاہی

مندرجہ بالا بیان کے پیشِ نظر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت لاہور میں مختلف الخیال ادارے اور اشخاص موجود تھے۔ اِدھر انجمن اسلامیہ لاہور کے سامنے کسی اچھے خطیب برائے بادشاہی مسجد کا مسئلہ تھا۔ اس وقت لاہور میں مولوی غلام مرشد صاحب خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ آپ حافظِ قرآن بھی ہیں علامہ اقبالؒ کو برائے انتخاب خطیب بادشاہی مسجد انجمن اسلامیہ نے پورا اختیار دے دیا تھا۔ چنانچہ علامہ نے مولوی غلام مرشد سے فرمایا کہ آپ جو اس طرح درس قرآن دے رہے ہیں، بہت مفید ہے مگر ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے مسائل حاضرہ میں ہر جمعہ کے روز بھی مستفید ہوں تو اس طرح آپ کو بادشاہی مسجد کے خطیب کے منصب کے لیے رضامند کر لیا۔ اگرچہ اس وقت بعض دیگر علماء نے بھی بطورِ آزمائش جمعہ کے خطبے دیے تھے۔ جن کو مَیں جانتا ہوں مگر آپ کو ہی پسند کیا گیا اور انہوں نے زیادہ رقوم بھی بطور تنخواہ طلب کی تھی مگر آپ نے اس کا کوئی تصوّر تک نہیں کیا اور آپ کے سامنے آزادی سے تعلیمِ اسلام دینا زیادہ مدِّ نظر تھا اور ہمیشہ آپ یہی کرتے رہے۔ چنانچہ آپ نے باقاعدگی سے منصبِ خطابت بادشاہی مسجد کو غالباً ۱۹۲۷ء سے سنبھال لیا جو آپ آخیر تک انجام

دیتے رہے اور اس طرح ہم ذرا وسعت نظری سے دیکھیں کہ مولوی غلام مرشد کا درسِ قرآن صبح و شام خطابت بادشاہی مسجد، فرائض صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ ایک طرح سب خدماتِ دینِ اسلام تھیں اور ہزاروں لوگ روزانہ مستفید ہوتے۔

غرضیکہ قبلہ مولوی غلام مرشد صاحب نے مسجد بادشاہی لاہور میں متواتر قریبًا چالیس سال تک نہایت بلند ہمّت اور اعلیٰ کردار سے خطبے دیے اور اس مسجد سے منسلک رہے اور ہر خطبہ جمعہ میں ضرور کچھ نہ کچھ خاص پہلو مضمر بھی ملے گا۔ راقم التحریر نے آخری خطبہ جو آپ سے اس مسجد میں سُنا اور اس روز آپ کے پیچھے نمازِ جمعہ بھی ادا کی، وہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) جمعۃ الوداع تھا، اور مجھے آپ کا وہ خطبہ خوب یاد بھی ہے۔ آپ نے حالاتِ حاضرہ اور کشمیر کے ذکر کے تحت قدرتی طور پر اعلانِ تاشقند کا بھی ذکر کیا۔ جو اُس وقت دراصل ۱۹۶۵ء کی جنگ پاک و ہند کے درمیان خاصی اہمیت رکھتا تھا اور وقت کا تقاضا بھی تھا۔ اس کے بعد پھر آج تک موقع نہیں ملا۔ میرے خیال میں اس جمعہ کے روز جس قدر نمازی حاضر تھے، وہ مَیں نے اس سے پیشتر نہیں دیکھے۔ اس کے بعد آپ کو امامت و خطابت مسجد بادشاہی کی ادائیگی سے سرکاری حکم کے ذریعے محروم کر دیا۔ لاکھوں مسلمان جو آپ کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوتے تھے محروم ہو گئے۔ یعنی آپ نے نہایت خاموشی اور بغیر کسی لالچ کے قریب چالیس سال فرائض اس مسجد میں انجام دیے۔ اگرچہ آپ درس قرآن عام لوگوں کو اس کے بعد بھی دیتے رہے جو آپ کی قانونی فتح بھی ہے کیونکہ گورنمنٹ اس کو باوجود کوشش کے بھی نہیں روک سکی، کیونکہ آپ کا یہ عمل عوام میں بہت مقبول ہے۔ اور آج بھی درس آپ کا جاری ہے۔

مَیں جب ۱۹۴۷ء کے اکتوبر کے مہینے میں پاکستان واپس آیا تو مجھے عید الاضحیٰ آپ کے پیچھے پڑھنے کا اتفاق ہُوا اور آپ نے جو خطبہ اس عید پہ دیا، وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پاکستان جمہوریہ اسلامی سب سے بڑی سلطنت ظہور میں آچکی ہے اور اسلامی ریاست یا حکومت کا تصور یہ ہے کہ ایک عورت سلطنت کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک نہایت حفاظت سے بلا خطر سفر کرے اور یہی اسلامی ریاست کا تصور ہے اور یہی اس عید کا خطبہ ہے اور ہم دُعا کرتے ہیں کہ پاکستان قائم رہے۔

علامہ اقبال نے بادشاہی مسجد میں خطبہ دیا

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال نے ۱۹۱۲ء میں اس مسجد میں ایک نظم جنگِ طرابلس کے موقع پر پڑھی تھی اور آپ نے ہی یہ محسوس کیا تھا کہ اس مسجد میں ایک اعلیٰ بین الاقوامی شہرت و قابلیت کا خطیب ہونا چاہیے، اس طرح ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ اس دوران میں علامہ کو ۱۹۳۳ء میں گلے کا عارضہ ہو گیا تھا اور آپ کو ذرا گفتگو کرنے میں دقّت ہوتی تھی، مگر مسلمانوں کے حالات کا اس وقت تقاضہ تھا کہ ان کی صحیح طور پر رہنمائی کی جائے۔ چنانچہ آپ نے ایک خطبۂ عید الفطر ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۲ء کے موقع پر شاہی مسجد میں عام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہُوئے دیا اور مولوی غلام مرشد بھی وہاں موجود تھے اور ضرورت کا تقاضا تھا اور یہ خطبہ غالباً طبع بھی ہُوا تھا۔ اسوقت یہ کارنامہ اسلامی رنگ میں بہت اہم تھا، خاص کر آپ نے مسلمانوں کو خطاب کیا اور فرمایا کہ اقتصادی طور پر مسلمانانِ پنجاب تقریبًا سو ارب روپیہ کے مقروض ہیں جس پر ہر سال تقریبًا چودہ کروڑ روپیہ سُود ادا کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر آپ نے اکثر قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بھی اپنے خطوط میں توجّہ دلائی تھی۔ اور یہ زمانہ سیاسی طور پر بہت بڑے ابتلا کا زمانہ تھا آخر ایام میں مولانا غلام مرشد بھی اکثر آپ کے ہاں میو روڈ والی کوٹھی جایا کرتے تھے اور اس کے بعد ساتھ ساتھ علامہ کی بیماری میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ مَیں ان دنوں ۱۹۳۶ء کے اواخر سے لے کر ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک لاہور سے باہر پیرس میں زیرِ تعلیم رہا جب یہاں ۱۹ اپریل کی صبح کو لاہور آیا تو اگلے روز ۲۰ اپریل کی شام قریب غروب آفتاب آپ کے ہاں حاضر ہُوا، اس وقت اتفاق سے بعض دیگر

احباب کے ہمراہ وہاں مولوی غلام مرشد بھی موجود تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو علامہ کا انتقال ہوا۔ لاہور میں المناک منظر جنازہ علامہ اقبال دیکھنے کے قابل تھا۔ بعض احباب اور اصحاب اختیار کے مشورے سے یہ طے پایا تھا کہ آپ کا جنازہ بادشاہی مسجد میں ہوگا اور ایک وفد نے گورنمنٹ سے مل کر یہ طے کیا کہ آپ کو بادشاہی مسجد کے باہر دفن کیا جائے گا۔ اس وفد میں مولوی غلام مرشد بھی شامل تھے، جن کی مساعی جمیلہ سے یہ مقام مرقد طے ہوا تھا، ممکن ہے آپ نے بحیثیت خطیب مسجد بادشاہی اس میں شرکت کی تھی۔ مگر اس حکم کے حصول میں آپ شامل تھے کہ حضرت علامہ کو مسجد کے باہر دفن کیا جائے۔ چنانچہ جنازہ آپ کے مکان میورروڈ سے بعد دوپہر اٹھایا گیا اور ہجوم اس قدر تھا کہ ہم اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ علامہ کا جنازہ شاہی مسجد کے اندر صحن میں دائیں طرف پڑھایا گیا تھا۔ اس سے پیشتر علامہ نے ہی اس مسجد کے لیے مولوی غلام مرشد کو انتخاب کیا اور خود مرحوم نے مولوی غلام مرشد کی موجودگی میں اس میں خطیب کے فرائض انجام دیے۔ آپ کی نماز جنازہ بھی اسی مسجد میں مولوی غلام مرشد نے پڑھایا اور آخر آپ کو اسی مسجد کے باہر دفن کیا گیا۔

یہ محض اتفاق ہے کئی سال پیشتر ایک مرتبہ علامہ اقبال عید الفطر کی نماز کے لیے اپنے دوست نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کے ہمراہ تشریف لائے مگر دیر میں پہنچے تھے۔ نماز کھڑی ہو چکی تھی اور آپ نے نماز عید الفطر قریب موجودہ جائے مقبرہ کے ہی ادا کی تھی، کیونکہ ہجوم بہت تھا۔ آخر آپ کا مقبرہ بھی یہیں تعمیر ہوا۔ علی بخش آپ کا ملازم بھی ہمراہ تھا۔

غرضکہ یہ ہمیشہ ہی تقاضا رہا کہ اس بادشاہی مسجد میں کوئی ایسا معقول عالم دین اسلام ہی خطیب ہو جو بالکل آزادی سے از روئے اسلام عوام کی رہنمائی کر سکے اور یہی ہر فرد و بشر اس مسجد کی مرکزی حیثیت سے متوقع رہا۔ اسی وجہ سے آپ خود علامہ اقبال نے تجویز کیا تھا کہ یہاں کسی طرح سے مولانا سید انور شاہ صاحب بطور خطیب آجائیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہم ذرا اس کے ابتدائی حالات سے تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کریں تو یہی نظر آئے گا۔ مولانا یار محمدؒ نے شاہ عالم بادشاہ کے سامنے احتجاج کیا اور اس کے بعد بھی یہی ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ کچھ ایک طرح مولانا غلام مرشد پر آکر ختم ہوا اور علامہ اقبال نے بھی اکثر یہی محسوس کیا کہ اس عظیم الشان مسجد کے منبر سے مسلمانانِ پاکستان کی صحیح خدمت ہو سکتی ہے اور یہی متذکرہ بالا واقعات سے عیاں ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۳۸ء سے جب میں یورپ سے واپس آگیا تھا۔ یہاں بادشاہی مسجد کے مشرق کی طرف نیچے حجروں میں مولوی محمد مصلح بانی عالمگیر تحریک قرآن بھی سکونت رکھتے تھے اور میں بھی ان کے فرمانے پر اس تحریک میں کام کرنے لگا۔ اس تحریک کے صدر شیخ رحیم بخش ریٹائرڈ سیشن جج تھے اور اکثر مولوی محمد مصلح کے ہمراہ ان کے مکان پر میٹنگ ہوتی تھی۔ ان کے ہمراہ بعض دیگر حضرات بھی تھے۔ اور انھوں نے ایک کتاب "قرآن اور علامہ اقبال" بھی لکھی تھی۔ میں جب ۱۹۴۰ء میں پونہ چلا گیا، اس کے بعد سے پھر مولوی محمد مصلح کا آج تک کوئی علم نہیں ہے۔

نتیجہ

ہم نے ان صفحات میں بادشاہی مسجد لاہور کا مختصر طور پر فن تعمیر، تاریخ، اس سے متعلق علماء و خطباء اور اس کا گرد و نواح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں مسجد بحیثیت عبادت گاہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں سے بالکل مختلف ہے۔ مسجد کا تعمیری ڈھانچہ یا ڈیزائن ہماری عبادت کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ ہر حال میں زمین جس پر وہ تعمیر کی جاتی ہے، وہ اس کی چار دیواری حدود اور نقشہ کو احاطہ کرتی ہے اور بنیادی نقشہ چار دیواری مسجد نبوی مدینہ منورہ ہمیشہ مدِ نظر رہتا ہے جس میں صحن مسجد، ایوانِ مسجد مع دیوار قبلہ رُخ و منبر و محراب اور مینار

ضرور مدنظر رہتے ہیں جن سے مسجد کی تعمیری کیفیت مجموعی طور پر قائم ہوتی ہے اور یہی ایک طرح تعمیر مسجد کی خصوصیات ہیں جنھوں نے ایک خاص حیثیت دُنیا میں اختیار کر لی ہے۔ لاہور میں ہی نہیں بلکہ تمام عالم میں ان کو ایک یکساں اور مشترک مقام حاصل ہے۔ چنانچہ لاہور میں یہ مسجد بادشاہی جو فی الحال مساجد عالم میں عظیم ترین مسجد ہے، ان امور میں ایک نہایت متمیز اور عالیشان نمونہ ہے۔ خاص کر لاہور میں اس مسجد کی تعمیر کے بعد جو مساجد تعمیر ہوئی ہیں، ان میں اس نقشہ کو فراخدلی سے بروئے کار لایا گیا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کی تعمیر میں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا اثر ہے جو بالکل بے بنیاد نظریہ ہے کیونکہ بنیادی طور پر مسجد ان سے بالکل مختلف ہے۔ عیسائی گرجا کا وجود بحیثیت عبادت گاہ عیسائی مذہب ۳۲۸ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا۔ اسی طرح ہندو مذہب کے منادر جن میں محض ایک بند اندھیرے والا کمرہ سا ہوتا ہے جس میں مشکل سے ایک پجاری کھڑا ہو سکتا ہے اور تعمیر میں بالکل سپاٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کی عمارتیں ہیں۔

ہم نے تعمیری خوبیوں کے علاوہ اس مسجد کی عمارت سے جو کچھ لاہور میں مختلف ادوار میں حالات رُونما ہوئے تھے اُن کو بھی مختصر بیان کیا ہے اور خاص کر لاہور کے دینی ماحول کا بھی تاریخی جائزہ مختصر بیان کر دیا ہے۔ غرضکہ یہ ایک عظیم ترین مسجد ہے جسے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۱۰۸۴ھ میں تعمیر کیا تھا۔

وما توفیقی الّا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

فہرست عہدیداران و ممبران انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور

لاہور میں انجمن اسلامیہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہو گئی تھی جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اتفاق سے اس انجمن کی ایک رپورٹ ۱۸۸۸ء میسر ہے جس میں ایک فہرست عہدے داراں اور ممبران انجمن ہذا دی ہے جو بہت اہم ہے۔ ہم یہاں ذیل میں اسے کسی قدر اختصار سے بطور ضمیمہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی تمام مسلمانانِ پنجاب اس مسجد سے وابستہ تھے۔

۱۔ آنریبل سر نواب حاجی نوازش علیخاں قزلباش لائف پریذیڈنٹ۔
۲۔ نواب عبدالمجید خان صاحب بہادر پریذیڈنٹ
۳۔ نواب حاجی ناصر علی خان صاحب وائس پریذیڈنٹ
۴۔ نواب محمد عنایت علیخاں صاحب بہادر رئیس لیرکوٹلہ۔ لائف وائس پریذیڈنٹ۔
۵۔ خان بہادر منشی تاج بخش صاحب لائف وائس پریذیڈنٹ۔
۶۔ خان بہادر فقیر سید جمال الدین صاحب وائس پریذیڈنٹ
۷۔ سردار محمد حیات خان صاحب بہادر فیروزپور آنریری لائف سیکرٹری
۸۔ خان بہادر راجہ جہانداد خاں صاحب چیف آف گکھڑ کیانی گوجرانوالہ آنریری لائف سیکرٹری۔
۹۔ خان بہادر سردار شیر محمد خاں صاحب امرتسر آنریری لائف سیکرٹری
۱۰۔ خان بہادر ملک قطب الدین صاحب لائف سیکرٹری۔
۱۱۔ خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب آنریری جنرل سیکرٹری
۱۲۔ مولوی محمد فضل الدین صاحب آنریری فنانشل سیکرٹری
۱۳۔ شیخ خیر الدین صاحب آنریری ایجوکیشنل سیکرٹری
۱۴۔ منشی محمد شہامت خاں صاحب اسسٹنٹ سیکرٹری
۱۵۔ حافظ امیر بخش صاحب رئیس و آنریری آمین
۱۶۔ میاں نبی بخش صاحب نقیب المومنین۔
۱۷۔ نواب محمد غلام سبحانی صاحب رئیس اعظم لاہور
۱۸۔ سردار محمد ابراہیم خاں صاحب مزاری رئیس ڈیرہ غازیخاں
۱۹۔ نواب محمد خان صاحب رئیس ڈیرہ غازیخاں۔
۲۰۔ صاحبزادہ محمد معروف خان صاحب رئیس بہاولپور
۲۱۔ خان بہادر منشی غلام نبی خاں صاحب بہادر دلپور
۲۲۔ خان بہادر فقیر سید ظہور الدین صاحب رئیس لاہور
۲۳۔ خان بہادر فقیر سید قمر الدین صاحب رئیس لاہور
۲۴۔ خان بہادر مولوی انعام علی صاحب رئیس لاہور
۲۵۔ خان بہادر میاں علم الدین صاحب باغبانپورہ
۲۶۔ خان بہادر شیخ نصیر الدین خان صاحب رئیس لاہور
۲۷۔ خان بہادر قاضی محمد اسلم خان صاحب کمشنر
۲۸۔ خان بہادر سید لاور علی شاہ صاحب رئیس لاہور
۲۹۔ خان بہادر پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے
۳۰۔ خان بہادر سید محمد لطیف لاہور
۳۱۔ نواب خان بہادر خان صاحب ممدوٹ
۳۲۔ خان بہادر حافظ سمندر خان صاحب رئیس ڈیرہ اسمٰعیل خان
۳۳۔ خان بہادر سید عالم شاہ صاحب آنریری مجسٹریٹ لاہور
۳۴۔ خان بہادر ڈاکٹر رحیم خان صاحب سول سرجن لاہور
۳۵۔ خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خان صاحب لاہور
۳۶۔ ڈاکٹر سید امیر شاہ صاحب سرجن لاہور
۳۷۔ ڈاکٹر امجد علی خاں صاحب ڈیرہ اسمٰعیلخاں
۳۸۔ مولوی محمد عثمان خان صاحب وزیر ریاست ممدوٹ
۳۹۔ مولوی خوشی محمد صاحب مشیر خاص ریاست ممدوٹ
۴۰۔ شیخ رحیم بخش صاحب سوداگر و آنریری مجسٹریٹ لاہور
۴۱۔ نواب احمد یار خاں صاحب تحصیلدار
۴۲۔ نواب فتح جنگ خاں صاحب رئیس اعظم جہجر۔
۴۳۔ میاں کریم بخش صاحب میونسپل کمشنر و رئیس لاہور
۴۴۔ میاں چراغ الدین صاحب میونسپل کمشنر و رئیس لاہور
۴۵۔ شیخ محمد حسین صاحب خلف شیخ مندسنگھان لاہور
۴۶۔ شیخ غلام حسن صاحب آنریری مجسٹریٹ امرتسر
۴۷۔ شیخ عمر بخش صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ ملتان
۴۸۔ خواجہ یوسف شاہ صاحب امرتسر
۴۹۔ بابو محکم الدین صاحب مختار عدالت امرتسر

۴۹۔ سید فضل شاہ صاحب میونسپل کمشنر لاہور
۵۱۔ منشی محمد بشیر علی خان صاحب تحصیلدار کوئٹہ
۵۲۔ منشی غلام نبی صاحب منصف ملتان
۵۳۔ مولوی تاج الدین احمد صاحب مختار عدالت لاہور
۵۴۔ مولوی محمد ظہور الدین صاحب رئیس باغبانپورہ
۵۵۔ منشی امیر الدین صاحب
۵۶۔ سید نادر علی شاہ صاحب سیفی مالک مطبع مفید ہند لاہور
۵۷۔ سید محمد شاہ صاحب پلیڈر چیف کورٹ
۵۸۔ منشی میراں بخش صاحب اکونٹنٹ لاہور
۵۹۔ حکیم غلام نبی صاحب زبدۃ الحکماء رئیس لاہور
۶۰۔ مولوی میر ممتاز علی صاحب مترجم چیف کورٹ لاہور
۶۱۔ شیخ امیر علی صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور
۶۲۔ منشی محمد الدین صاحب ڈویژنل کورٹ لاہور
۶۳۔ شیخ عمر بخش صاحب پلیڈر ہوشیارپور
۶۴۔ حافظ عبد الرحمن صاحب گرداور قانونگو امرتسر
۶۵۔ منشی الہداد صاحب اوورسیر ملتان
۶۶۔ مولوی محمد عبد اللہ خان صاحب سنٹرل ماڈل سکول لاہور
۶۷۔ سید نادر علی شاہ صاحب تحصیلدار لاہور
۶۸۔ میاں چراغ الدین صاحب ٹھیکہ دار لاہور
۶۹۔ ملک لبا صاحب میونسپل کمشنر
۷۰۔ چوہدری شیر محمد صاحب رئیس میاں میر
۷۱۔ چوہدری کاکا صاحب ٹھیکہ دار میاں میر
۷۲۔ منشی محمد مہتاب الدین صاحب اوورسیر راولپنڈی
۷۳۔ منشی احمد بخش صاحب مثلخواں چیف کورٹ
۷۴۔ منشی محمد عبد الغنی صاحب ڈویژنل کورٹ انبالہ
۷۵۔ میاں شمس الدین صاحب اوورسیر لاہور
۷۶۔ سید رجب علی شاہ صاحب نیو امپیریل پریس لاہور
۷۷۔ قاضی ظفر الدین صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور
۷۸۔ منشی محمد عبد اللہ صاحب نقشہ نویس
۷۹۔ مولوی محمد فضل الدین صاحب پروپرائیٹر دہلی پنچ
۸۰۔ مولوی محمد رکن الدین صاحب معتمد سردار دیال سنگھ
۸۱۔ میاں عبد الرحیم صاحب قادرو غہ رنگمحل لاہور
۸۲۔ قاضی محمد شمس الدین صاحب رئیس لاہور
۸۳۔ منشی غلام محمد صاحب سررشتہ دار ضلع لاہور
۸۴۔ میاں محمد نظام الدین صاحب باغبانپورہ
۸۵۔ منشی محمد عظیم خان صاحب میونسپل کمشنر قصور
۸۶۔ میاں دین محمد صاحب باغبانپورہ
۸۷۔ میاں جلال الدین صاحب باغبانپورہ
۸۸۔ میاں امین الدین صاحب باغبانپورہ
۸۹۔ میاں کریم بخش صاحب باغبانپورہ
۹۰۔ مولوی غلام فرید صاحب باغبانپورہ
۹۱۔ مرزا عبد الرحیم صاحب اکونٹنٹ محکمہ انہار
۹۲۔ حاجی نجم الدین صاحب لاہور
۹۳۔ چوہدری اسلام دین صاحب
۹۴۔ حاجی منشی یار محمد صاحب
۹۵۔ حکیم سید عالم شاہ صاحب لاہور
۹۶۔ میاں فضل الدین صاحب ریلوے لاہور
۹۷۔ محمد وزیر خان صاحب ملک التجار اسپان
۹۸۔ محمد افضل خان صاحب ملک التجار اسپان
۹۹۔ محمد اسلم خان صاحب ملک التجار اسپان
۱۰۰۔ حکیم شجاع الدین صاحب رئیس لاہور
۱۰۱۔ بابو کرم الٰہی صاحب اسٹیشن ماسٹر ملتان
۱۰۲۔ حکیم سید نجف شاہ صاحب رئیس لاہور
۱۰۳۔ میاں نبی بخش صاحب نقیب المومنین
۱۰۴۔ میاں الٰہ بخش صاحب ذیلدار لاہور
۱۰۵۔ منشی کرم الٰہی صاحب سررشتہ دار یونیورسٹی
۱۰۶۔ محمد امجد علی خان صاحب
۱۰۷۔ منشی چنن الدین صاحب اکونٹنٹ ریلوے لاہور
۱۰۸۔ ڈاکٹر الٰہی بخش صاحب ریلوے اسپتال لاہور
۱۰۹۔ منشی نور نبی صاحب انجمن پنجاب سکھشا سبھا لاہور
۱۱۰۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب ایم او ایل
۱۱۱۔ منشی شمس الدین صاحب مالک پنجابی اخبار لاہور
۱۱۲۔ سید بہادر شاہ صاحب لاہور
۱۱۳۔ حکیم شہاب الدین صاحب لاہور
۱۱۴۔ امام الدین صاحب محافظ دفتر فنانشل کمشنر
۱۱۵۔ مولوی خلیفہ رجب الدین صاحب سوداگر لاہور
۱۱۶۔ منشی محمد بخش صاحب ٹھیکہ دار لاہور
۱۱۷۔ میاں نور محمد صاحب خلف منشی شہامت خان لاہور
۱۱۸۔ میاں عبد الصمد صاحب برادر زادہ میاں کرم بخش لاہور
۱۱۹۔ منشی احمد الدین صاحب سررشتہ دار میاں کریم بخش لاہور
۱۲۰۔ منشی میراں بخش صاحب ایجنٹ کوپ صاحب لاہور
۱۲۱۔ سید اکبر علی شاہ صاحب وکیل فرید کوٹ
۱۲۲۔ مرزا محمد علی صاحب معتمد محمد وزیر خان ملک التجار
۱۲۳۔ منشی احمد حسین خان صاحب خلف خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین
۱۲۴۔ منشی میراں بخش صاحب وکیل ڈیرہ غازی خان
۱۲۵۔ منشی خیر الدین گورنمنٹ پریس لاہور
۱۲۶۔ مرزا اصغر علی بیگ صاحب معتمد راجہ جموں
۱۲۷۔ میاں نظام الدین صاحب خلف میاں کریم لاہور
۱۲۸۔ میر عالم خان صاحب رسالدار میجر
۱۲۹۔ چوہدری غلام محی الدین قصاب خانہ لاہور
۱۳۰۔ سید احمد شاہ صاحب کارخانہ دار گاڑی بھاٹی لاہور
۱۳۱۔ سید محمد سراج الدین صاحب خلف محمد عظیم لاہور
۱۳۲۔ شیخ گلاب الدین صاحب مختار عدالت لاہور
۱۳۳۔ شیخ رحیم بخش صاحب رئیس جالندھر
۱۳۴۔ مرزا سلطان احمد صاحب تحصیلدار لاہور
۱۳۵۔ منشی محمد ابراہیم صاحب چیف کورٹ لاہور
۱۳۶۔ منشی حسین بخش صاحب چیف کورٹ پنجاب
۱۳۷۔ فقیر سید ظفر الدین صاحب انسپکٹر پولیس ریلوے
۱۳۸۔ سردار حمید اللہ خان پشاور
۱۳۹۔ شیخ نانک بخش صاحب وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی لاہور
۱۴۰۔ بابو گل محمد صاحب سکریٹریٹ آفس لاہور
۱۴۱۔ محمد عبد اللہ جان صاحب لدھیانوی وکیل سہارنپور
۱۴۲۔ مولوی عمر الدین صاحب ایم اے ہیڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل سکول لاہور
۱۴۳۔ حاجی محمد اسمٰعیل خان صاحب رئیس دتاولی ضلع علیگڑھ
۱۴۴۔ مولوی نیاز علی صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کرنال
۱۴۵۔ مولوی سجاد حسین صاحب انسپکٹر مدارس فیروزپور
۱۴۶۔ مولوی غلام محمد صاحب آنریری مجسٹریٹ فیروزپور
۱۴۷۔ سید نادر علی شاہ صاحب ڈپٹی انسپکٹر پولیس ضلع جھنگ
۱۴۸۔ منشی حاکم علی صاحب انسپکٹر پولیس مریدکے
۱۴۹۔ مولوی محمد اشرف صاحب انسپکٹر مدارس گوجرانوالہ
۱۵۰۔ مرزا محمد رحمت اللہ بیگ صاحب وکیل بنارس
۱۵۱۔ منشی مولا بخش صاحب منصف خورجہ
۱۵۲۔ حافظ احمد علی صاحب سوداگر انارکلی
۱۵۳۔ راجہ کرامت اللہ خان صاحب تحصیلدار راجنالہ
۱۵۴۔ حاجی فقیر سید فیروز الدین صاحب کرنل لاہور
۱۵۵۔ شیخ رحمت اللہ صاحب سوداگر گجرات
۱۵۶۔ منشی میراں بخش صاحب منصف ضلع گجرات
۱۵۷۔ فقیر سید حسن الدین صاحب کپتان لاہور
۱۵۸۔ مسٹر عنایت اللہ بیرسٹر راولپنڈی
۱۵۹۔ مولوی غلام ربانی صاحب لوکل فنڈ ہزارہ
۱۶۰۔ صاحبزادہ غلام صادق صاحب منیجر جان محمد شاہ امرتسر
۱۶۱۔ شیخ احمد الدین صاحب سوداگر لاہور
۱۶۲۔ شیخ حسین بخش صاحب اپیل نویس لاہور
۱۶۳۔ میاں بوٹا صاحب معتمد میاں محمد سلطان لاہور
۱۶۴۔ غلام محمد خان صاحب سابق ڈپٹی انسپکٹر قصور
۱۶۵۔ خان بہادر خان صاحب نقل نویس قصور
۱۶۶۔ سید چراغ شاہ صاحب میونسپل کمشنر قصور
۱۶۷۔ غلام محمد صاحب ذیلدار قصور
۱۶۸۔ میاں چراغ الدین صاحب ذیلدار قصور
۱۶۹۔ امیر اللہ خان صاحب سررشتہ دار مرزا ظفر اللہ
۱۷۰۔ مولوی سید قاسم شاہ صاحب مجتہد لاہور
۱۷۱۔ مولوی نور احمد صاحب رئیس لاہور
۱۷۲۔ مولوی غلام محمد صاحب بگوی امام مسجد شاہی
۱۷۳۔ مولوی قاضی خلیفہ حمید الدین صاحب لاہور
۱۷۴۔ مولوی ابو سعید محمد حسین صاحب لاہور
۱۷۵۔ مولوی احمد علی صاحب واعظ لاہور
۱۷۶۔ مولوی غلام اللہ صاحب مدرسہ اسلامیہ امرتسر
۱۷۷۔ مولوی محمد الدین صاحب باغبان پورہ۔

مؤلف کی دیگر تالیفات

۱- The Badshahi Masjid, History and Architecture صفحات قریباً ۴۰ بڑا سائز۔ ۲۶ صفحات پلیٹ (۲۲ × ۲۹/۴)

۲- بادشاہی مسجد لاہور (۱۸ × ۲۳/۴) (اُردو) تصاویر ۱۳ -

۳- تاریخ نقش نگار، (۲۰ × ۳۰/۸) ایک سو سے زائد صفحات اور تصاویر ۶۵ صفحات پلیٹ -

۴- تاج محل آگرہ Le Tadj Mahal d'Agra (French) Brusselles. 1938. (۲۰ × ۳۰/۸) ۱۸۴ صفحات و ۶۵ تصاویر - اُردو اشاعت -

۵- Painting during the Sultanate Period —1963 -

۶- بابا فرید شکر گنج، درگاہ پاک پٹن - (انگریزی) Pakpattan and Baba Farid Ganj-i-Shakar -

۷- لاہور میں موجود قدیم ترین اسلامی عمارت - (انگریزی) The Oldest Extant - مع تصاویر (۲۰ × ۲۶/۸) Muslim Architectural Relic at Lahore -

۸- سیرۃ حضرت بلال رضؓ - (۲۰ × ۲۶/۸) دو پلیٹ تصاویر و صفحات ۱۹۲ اعلیٰ کپڑے کی جلد -

۹- مغربی آرٹ کی مختصر تاریخ (۲۰ × ۲۶/۸) ۱۶ صفحات -

۱۰- فنون لطیفہ بعہد اورنگ زیب عالم گیر (۱۷ × ۲۷/۸) -

۱۱- جہانگیر کا ذوق مصوری - (۲۰ × ۲۶/۸) صفحات ۳۰ -

۱۲- حالات ہنروران - تصنیف دوست محمد کتابدار ۹۵۲ھ (۱۷ × ۲۷/۸) تذکرہ خطاطان و نقاشان -

۱۳- ریحان نستعلیق - ۹۸۹ھ (۱۷ × ۲۷/۸) فن خط و تذکرۂ -

۱۴- قوانین خطوط - مصنف محمود بن محمد - ۹۹۰ھ تاریخ خط -

۱۵- علم الکتابت - مصنفہ ابو حیان توحیدی متوفی ۴۱۴ھ تاریخ خط (۲۰ × ۲۶/۸) تین پلیٹ تصاویر -

۱۶- رسالہ میر علی تبریزی خط نستعلیق (۲۰ × ۳۰/۱۶) -

۱۷- علم پروری و ہنر شناسی - حالات و کیفیت مصنفین -

۱۸- کھٹو - راجستھان کی ایک تاریخی بستی (۱۸ × ۲۳/۸) -

۱۹- سودھرہ - پنجاب کی قدیم تاریخی بستی (۲۰ × ۲۶/۸) -

۲۰- تاریخ مظفر شاہی معرکہ گجرات و مالوہ ۹۲۰ھ از قانعی -

۲۱- ملحق - سیرالاخبار - از شیخ محمد بیگ نقشبندی برہانپوری - ۱۱۰۱ھ عربی زبان میں تاریخ ہندوستان -

۲۲- لاہور کی کہانی آثار کی زبانی -

۲۳- تاریخی آثار - گرد انجینیرنگ یونیورسٹی لاہور مع چند تصاویر -

۲۴- مسجد نبوی - مدینہ منورہ - مصور (۱۸ × ۲۳/۴) -

۲۵- مساجد عالم پر مبسوط مقدمہ اور تاریخی مساجد لاہور -

۲۶- سرگذشت خط نستعلیق مع ۴۵ پلیٹ بے شمار خط کے نمونے -

۲۷- لاہور سکھوں کے عہد میں - (۲۰ × ۳۰/۱۶) مع ۲ تصاویر قدیم مسجد شہید گنج -

۲۸- ظفر خان اور اس کا مصور کلام - (۲۰ × ۳۰/۸) مع چند اہم تصاویر عہد شاہجہان از مصور بشنداس -

۲۹- پنجاب میں مصوری کی ایکصدی - (انگریزی)

۳۰- وقائع سیالکوٹ مصنفہ محمد مقیم بن رحمتہ اللہ - ۱۰۷۱ھ -

۳۱- اسلامی مصوری - ترمیم شدہ اشاعت (۱۷ × ۲۷/۸) -

۳۲- اسلامی کوزہ گری - (۱۷ × ۲۷/۸) مصور -

۳۳- نمائش اسلامی ثقافت ۱۹۵۸ء (۲۰ × ۲۶/۸) (انگریزی) -

۳۴- احمد معمار لاہوری اور اس کا خاندان -

۳۵- علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی - لاہور کی علمی مجالس -

۳۶- طبقات ناصری: (فارسی) طبقات متعلق تاریخ ہند -

۳۷- سید سلیمان ندوی اور ان کے چند خطوط (۲۰ × ۳۰/۸) -

۳۸- مثنوی نل دمن فیضی - نسخہ - ۴ تصاویر - (۱۸ × ۲۳/۴)

۳۹- محمد بن تغلق سلطان - (انگریزی ترجمہ از عربی -

۴۰- تمدنی - ثقافتی - جغرافیائی - مذہبی اسباب کا اثر ارتقاء فن اسلامی تعمیر پر -

۴۱- واقعات عالم گیری - عاقل خان رازی (۱۱۰۸ھ) فارسی -

۴۲- منظوم تاریخ سلاطین بہمنیہ - ۱۲۰۰ھ اُردو -

۴۳- قدیم مساجد ہند و پاکستان اور ان کا فن تعمیر -

۴۴- فن تعمیر (اُردو) یونیسکو کے منصوبہ کے تحت لکھا گیا -

۴۵- فتوحات فیروز شاہی (فارسی متن و ترجمہ) (۱۸ × ۲۳/۸) -

۴۶- Miniature—Painting from Pakistan - پاکستان میں مصوری کی داستان -

۴۷- موسم گل کی یادگار (شالامار باغ) (۱۸ × ۲۳/۴) -

۴۸- اسلامی فن تعمیر ہند و پاک پر ایران و توران کا اثر -

۴۹- قرآن کریم میں آثار و تعمیر کا مختصر مطالعہ -

۵۰- قلعہ لاہور کی مختصر تاریخ مع قدیم نقشہ قلعہ -

۵۱- 'اقبال کی صحبت میں' تذکرہ (زیر طبع) -

۵۲- روایات متعلق اقبال از احباب اقبال (زیر طبع) -

۵۳- Some Aspects of Muslim Architecture -

۵۴- آئینۂ لاہور (اقتباسات) زیر طباعت - (تاریخ لاہور)

۵۵- تمدن ہند میں دکن کا حصہ، اُردو انگریزی ۱۹۳۶ء -

۵۶- مساجد سمرقند - اسلامی فن تعمیر میں ہندوستان کے وسط ایشیا سے تعلقات (انگریزی) The Mosques of Samarqand—Indian links with Centrral Asia in Architecture -

۵۷- The Illustrated Edition of the Razm Nama -

۵۸- ڈکشنری - مصورین ممالک اسلامیہ (انگریزی) A Dictionary of Miniature—Painters from Islamic Countries—(in preparation) (زیر ترتیب) -

۵۹- کمال الدین بہزاد مصور - اردو و انگریزی مع تصاویر

۶۰- ...e During the Mediaeval Period (in Press)

۶۱- ...red Tiles from Samarra in the Ashmolean Museum, Oxford 1933 -

۶۲- ...m Monuments of Ahmadabad Through their Inscriptions, with several plates, 1940.

۶۳- Nagour a Forgotten Kingdom, 1942.

مکمل فہرست طلب فرمائیں